

ISSN 0548-0663 (UGC CARE List)

زبان و ادب، تہذیب و ثقافت کا ترجمان

ننگہ گور

جولائی ۲۰۲۳ء



۱۵ روپے

محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ، اترپردیش





جناب وزیر اعلیٰ یوگی آدیتھ ناتھ اندرا گاندھی پرستھان میں 'آکا نشاٹ' کا افتتاح کرتے ہوئے ساتھ میں موجود نائب وزیر اعلیٰ برجیش پاٹھک۔



جناب وزیر اعلیٰ یوگی آدیتھ ناتھ گورکھپور کے وننگیا گاؤں میں دیوالی کے موقع پر ایک خاتون کو امدادی چیک دیتے ہوئے۔

مضامین

- ۳ پروفیسر فضل امام شخص اور شخصیت پروفیسر فاروق بخش
۶ سہیل نامہ کارنامہ صبیحہ انور
۸ مالک رام کی خاکہ نگاری ڈاکٹر علی حیدری
۱۲ مالک لکھنوی شخصیت کے آئینے میں تحریر ڈاکٹر تناسیم
۱۴ منشی بساؤن لال شادال اور امیر نامہ ڈاکٹر راشد میاں
۱۷ پطرس بخاری: اردو کا نمائندہ طنز و مزاح نگار ڈاکٹر احسان عالم
۲۰ میر غلام رسول نازکی کی شاعری پر اقبال کے اثرات جمشید جہاں آرا
۲۲ فارسی زبان و ادب اور راجہ رتن سنگھ زخمی ڈاکٹر ناظر حسین

منظومات

- ۷ غزل ڈاکٹر احمد منظور
۱۱ غزل آمل الد آبادی
۱۳ غزل ڈاکٹر جوی بیگم شاما
۲۴ غزلیں محمود کاکوروی/فرا آرزوی
۲۵ غزلیں ڈاکٹر حمایت بآسی/ظفر اقبال ظفر
۲۶ غزلیں سراج سکینہ/شاذیہ خان
۲۸ غزل عرفان نجمی

افسانے

- ۲۷ مجھے یقین ہے کہ..... اشفاق برادر
۲۹ میری بیٹی ڈاکٹر عبد الغفار فاروقی

افانچہ

- ۳۱ کالج کی گویا عافیہ حمید

ترقیات

- ۳۲ اتر پردیش میں غریبوں کے لئے اپنا گھر شاہد عباس

جولائی ۲۰۲۳ء

سرپرست

جناب سنجے پرساد

پرنسپل سکریٹری، محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ، اتر پردیش

پبلشر: بششتر (ڈاکٹر، انفارمیشن)

جناب انشمان تریپاٹھی (ایڈیشنل ڈاکٹر، انفارمیشن)

ادارتی مشنر

محترمہ محکم شرمما (ڈپٹی ڈاکٹر، انفارمیشن)

ایڈیٹر

ریحان عباس

رابطہ: 9838931772

Email: nayadaurmonthly@gmail.com

معاون

شاہد کمال

نظارت: آسیہ خاتون، 9721856191

رابطہ برائے سرکولیشن وزیر سالانہ:

صبا عرفی: 7705800953

ترکین کار: ایم. ایچ. ندوی

مطبوعہ: پرکاش پبلیشرز، گولہ گنج، لکھنؤ
شائع کردہ: محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ، اتر پردیش
زیر سالانہ: ۱۸۰ روپے

ترسیل زر کا پتہ

ڈاکٹر انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

پنڈت دین دیال آپادھیائے سوچنا پریسر، پارک روڈ،

اتر پردیش، لکھنؤ 226001

Please send Cheque/Bank Draft in favour
of Director, Information & Public Relation
Department, Pandit Deendayal Upadhyay
Soochna Parisar, UP, Lucknow

خط و کتب کا پتہ

ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ باکس نمبر ۱۳۶، لکھنؤ ۲۲۶۰۰۱

بذریعہ کوریئر یا رجسٹرڈ پوسٹ

ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ

پارک روڈ، سوچنا بھون، اتر پردیش، لکھنؤ 226001

نیا دور میں شائع ہونے والے تمام تر مضمومات میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، اس کی پوری ذمہ داری مصنف کی ہے۔ حکومت اتر پردیش کا متفق ہونا بہر حال ضروری نہیں ہے۔

For Latest Issues of Naya Daur visit at www.information.up.nic.in

اپنی بات

ماہنامہ نیادور جولائی ۲۰۲۳ء کا شمارہ حاضر ہے۔

مجھے یہ بتاتے ہوئے بیدار خوشی محسوس ہو رہی ہے اب لکھنؤ والوں نے کتابوں کے تئیں اپنا شوق ظاہر کیا ہے، ہندی انگریزی کے ساتھ اردو کی کتابیں بھی لکھنؤ والوں کی پسند بن رہی ہیں، تہذیب کے شہر لکھنؤ میں کتابوں کی قدردانی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ تقریباً تین برسوں سے کتب میلہ کا انعقاد ماہ نومبر میں گومتی نگر واقع ریور فرنٹ پر بھارت سرکار کی نیشنل بک ٹرسٹ سوسائٹی (سنستھا) کی جانب سے منعقد کیا جاتا ہے۔ کتب میلہ کے انچارج سے اس بارے میں بات کی تو انہوں نے بتایا کہ اس کتب میلہ کی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں بچوں کے لیے کریٹیو رائٹنگ، کہانی لکھنا، کامکس بنانے کے ساتھ نوجوانوں کے لیے کئی پروگرام منعقد کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں پر ایک مقابلہ جاتی اسٹیج بنایا جاتا ہے جس پر علم و ادب پر مختلف موضوعات، زاویوں پر روشنی ڈالتے ہوئے بحث و مباحثہ کیا جاتا ہے، لکھنؤ کی تاریخ، گنگا جمنی تہذیب پر گفتگو کی جاتی ہے۔ اس اسٹیج سے مقامی و بیرونی، بین الاقوامی سطح کے آرٹسٹ پروگرام پیش کرتے ہیں۔ اس کتب میلہ میں قریب ایک ہزار سے زائد ملک سے پبلشرز آتے ہیں جن کے ۱۵۰ سے زیادہ اسٹال لگائے جاتے ہیں۔

اس وقت سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اہل لکھنؤ زیادہ تر کتب سے جڑے ہوئے ہیں۔ کتب میلہ کے انچارج نے بتایا کہ لکھنؤ میں دو طرح کے ریڈرس گروپ ہیں۔ ایک انگلش اور دوسرا ہندی لٹریچر وارڈ ولٹریچر۔ لکھنؤ کے لوگ پریم چند نرالا، بھگوتی چرن ورما کے ساتھ شعر و شاعری والی کتابیں خوب خریدتے ہیں۔ پبلشرز بتاتے ہیں کہ لکھنؤ کے لوگوں کو جانکاری بہت ہے کیونکہ وہ کتابوں کو ڈھونڈ کر پڑھتے ہیں۔ آج کے دور میں جہاں لوگ ڈیجٹل سے جڑے ہیں اور کتابوں سے دور ہو رہے ہیں ایسے میں لکھنؤ والے آج بھی کتابوں سے جڑے ہیں۔

لکھنؤ کے لوگ کتابوں کے اتنے شوقین ہیں اس بات کا پتہ اس سے چلتا ہے کہ گذشتہ دنوں بلرام پور گارڈن میں لگے ۲۱ ویں نیشنل بک فیئر میں تقریباً ۵۷ لاکھ کتابیں کتب کے شوقین لوگوں نے خرید ڈالیں۔ لکھنؤ کے لوگ کتابوں کے صرف شوقین ہی نہیں ہیں بلکہ کتب کو لے کر اچھی سمجھ بھی رکھتے ہیں۔ اس بات کا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بک فیئر میں ایک ہجوم سالگاہر ہوتا ہے۔

۹ نومبر سے ریور فرنٹ پر کتب میلہ کا آغاز ہو گیا۔ ۲۰۱۳ میں نیشنل بک فیئر میں ڈاکٹر اے پی جے ابوالکلام تشریف لائے تھے اس سال سب سے زیادہ کتابیں یعنی کہ دو کروڑ روپے کی کتابیں فروخت ہوئی تھیں۔ اس کے بعد کووڈ کے بعد جب بھی کہیں کوئی بک فیئر لگایا گیا تو پھر اس سطح کا مجمع میسر نہیں ہوا لیکن اب ایک بار پھر رونق نظر آنے لگی ہے، گذشتہ دو برسوں میں کتابوں سے شوق رکھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ اب تو کتب میلہ میں پوری فیملی آتی ہے۔ یہ بتاتے ہوئے بڑا فخر محسوس ہوتا ہے کہ لوگوں نے کتابوں کی خریداری میں اپنا بھرپور تعاون پیش کرنا شروع کر دیا ہے جو اردو ادب کے لیے قابل تحسین ہے۔۔

ریحان عباس

یہ شمارہ جولائی ۲۰۲۳ء کا ہے جس کو نومبر ۲۰۲۲ء میں شائع کیا جا رہا ہے۔

پروفیسر فاروق بخشی

فلیٹ نمبر ۷۰۱، ٹاور نمبر ۸، پروانچل رائل پارک، سیکٹر ۷، ۱۳۷، لاہور

9829808782



پروفیسر فضل امام شخص اور شخصیت

عصر حاضر کے ممتاز ادیب، نقاد، دانشور اور شاعر پروفیسر فضل امام رضوی بھی اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ وہ عرصہ دراز سے صاحب فراش تھے اور علالت کے دور سے گزر رہے تھے۔ جو اس جہان فانی میں آیا ہے وہ یقیناً یہاں سے جانے گا اس سنگین حقیقت کے باوجود کئی شخصیتوں کا محفل جہاں سے یوں چلے جانا دلوں پر شاق گزرتا ہے۔ فضل امام صاحب جنہیں اب مرحوم لکھنا ہی پڑے گا ایسی شخصیات میں شامل تھے جن کے بغیر بزمِ علم و ادب عرصہ دراز تک سونی سونی نظر آئے گی۔ ان کی تحریر ان کی تقریر اور ان کی بذلہ بخشی سے پرکشتہ نئی ایسے اوصاف تھے جو ہر محفل کو زعفران زار بنا دیتے تھے۔ ان کی باغ و بہار شخصیت اور ان کے سنے تے تیز طرار جملے اچھے اچھوں کو سنہلنے کا موقع نہیں دیتے تھے جو ان کے دوست بھی تھے اور دشمن بھی مگر فضل امام ہمیشہ اپنی کج کلاہی کے بھرم کو قائم رکھتے تھے۔ ترقی پسند فکر کے حامل تھے اور پھر جو شخص کو بلا کو خرزاں بناتے ہوئے ہو وہ جین کے ساتھ ساتھ احتجاج اور انقلاب کو بھی سمجھتا ہے۔

میری ان کی پہلی ملاقات 1979ء کی جاتی ہوئی سردیوں کے دنوں میں بے پور کے ایک مشاعرے میں ہوئی۔ میں ان دنوں اجیر میں تھا۔ میر ٹھ سے قبلہ حفیظ میر ٹھی کا خط آیا کہ بے پور میں فلاں تاریخ کو مشاعرہ ہے۔ میں اجیر آجاتا ہوں وہاں سے دونوں بے پور چلیں گے۔ حفیظ صاحب صبح سویرے اجیر پہنچ گئے۔ دوپہر والی ٹرین سے ہم دونوں بے پور پہنچ گئے۔ رات کو مشاعرے میں میر ٹھ کے پدم شری کیم سیف الدین بھی مجلسِ صدارت پر جلوہ افروز تھے۔ غالباً سیف صاحب کے ایک عزیز نصر بھائی مشاعرے کی انتظامیہ کمیٹی سے متعلق تھے۔ میرے ایک عزیز دوست اختر عادل جو شعبہ پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف میں انجینئر تھے ان دنوں وہیں تعینات تھے۔ معروف جدید شاعر ممتاز شکیب بھی وہاں آل انڈیا ریڈیو کے عہدے دار تھے اور میر ٹھ ان کی سسرال تھا۔ یوں اس مشاعرے میں میر ٹھ والوں کا بول بالا تھا۔ فضل امام صاحب کو وہیں پہلی مرتبہ شعر پڑھتے ہوئے دیکھا بھی اور نا بھی۔ آواز بڑی کڑک دار اور گھن گرج والی تھی، لہجہ کچھ پوربی انداز لیے ہوئے ضرور تھا مگر ذہن کو اپنی طرف کھینچنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ پتہ چلا ڈاکٹر فضل امام راجستھان یونیورسٹی کے شعبہ اردو و فارسی میں صدر شعبہ ہیں۔ ہماری تو طالب علمی کا زمانہ تھا اور ہماری خوب بھی فدیاء تھی۔ اگلے روز ممتاز شکیب صاحب نے مجھے حفیظ میر ٹھی اور فضل امام صاحب کو ریڈیو کی ادبی نشست کہنشاں کے لیے مدعو کر لیا۔ کیا تو وسیم بریلوی کو بھی تھا مگر انہیں کسی دوسرے مشاعرے کے لیے لگانا تھا سو معذرت کر لی۔ فضل امام صاحب کا رویہ اپنے خوردوں کے ساتھ عام طور پر دوستانہ ہوا کرتا تھا۔ ممتاز شکیب یونیورسٹی میں ان کے طالب علم رہے تھے مگر یہ تعلق بے تکلف دوستی میں تبدیل ہو گیا تھا اور وہ شکیب صاحب کو بڑی بے تکلفی سے ”شکیب“ کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔ ریڈیو کی نشست کے بعد آکاش وانی کی کمیٹیوں میں کافی کے لیے گئے۔ وہ اپنی گل افشانی گفتار سے سب کو محظوظ کرتے رہے۔ میری طرف دیکھ کر کہنے لگے میاں اچھا پڑھتے ہو۔ میں سمجھ گیا یہ ایسی ہی تعریف تھی جیسے مولانا ابوالکلام آزاد کی تقریر سن کر حالی نے کہا تھا۔ میاں اچھا بول لیتے ہو۔ جی میں تو آئی کہہ دوں حضور اچھا کہنے کی کوشش بھی کرتا ہوں مگر خاموشی کو ہی اپنی عافیت جانا۔ کیونکہ میں آئندہ کے امکانات کو محدود نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پھر تو ان سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دسمبر 1980ء میں دہلی منتقل ہو گیا تو وہ جب بھی دہلی آتے پہلے سے اپنی آمد سے مطلع کرتے اور میں ان کی قیام گاہ پر حاضر ہوتا۔ دوسری اور یادگار ملاقات راشدی بھون کے مشاعرے میں ہوئی۔ گجانی ذیل سنگھ ان دنوں صدر جمہوریہ تھے۔ اردو ان کی زبان تھی۔ شعر و شاعری کے رسیا۔ مجھے دیکھتے ہی زور سے بولے اے بخشی یہاں بھی ادم ہے بھی ادم ہے۔ مشاعرے میں انہوں نے اپنی پاٹ دار آواز میں کوئی نظم سنائی ان کا خطیبانہ انداز ذکر کا تجربہ کل مجمع پر چھا گئے۔ اس دن میں نے نرم سے غول پڑھی۔ داد دیتے ہوئے بولے اچھی آواز ہے میں نے کہا امام صاحب

”انعام الحق صاحب کے انتقال کے بعد اب بے پور میں اردو کا ایسا شیدائی ڈھونڈھنے سے بھی نہیں ملے گا۔ فضل امام صاحب کی سرگرمی، سرکردگی اور سربراہی قدم قدم پر جلوہ گر ہو رہی تھی۔ سب ان کے حسن انتظام کی داد دے رہے تھے دوسرے دن شام کو تمام مہمان رخصت ہو گئے۔ ابن کنول اور اتشی کریم کہنے لگے ہم کل جائیں گے۔ آج تم ہمیں بے پور سیر کے لیے لے چلو۔ رات کا وقت تھا ہم سب پیدل ہی مرزا اسماعیل روڈ پر چلے جاتے تھے کہ سامنے سے شیروانی میں ملبوس ایک صاحب کو برقعہ پوش خاتون کے ساتھ ایک رکشا پر آتے ہوئے دیکھا۔ دل کو یقین نہیں ہوتا تھا کہ دن میں جس شخص کو سوٹ اور ٹائی میں دیکھا تھا وہ اب رات کو شیروانی میں۔ رکشا قریب آیا تو یقین پختہ ہوا کہ فضل امام صاحب ہی ہیں۔ وہیں رکشا پر سے زور سے بولے اے بخشی! دن میں ہو گئی ترقی پسندی، اب ہم مجلس میں جا رہے ہیں، جین کی بارگاہ میں۔“

کبھی شعر کی تعریف بھی کیجئے تو مسکرا کر رہ گئے۔ میں نے یہ واقعات اس لیے بیان کیے کہ زیادہ تر احباب ان کی شعری شخصیت سے نا آشنا ہیں بلکہ ان کے استاد پروفیسر محمود الہی کی شخصیت کی طرح۔ کتنے لوگ واقف ہیں کہ وہ ایک زمانے میں محمود الہی زخمی ہوا کرتے تھے۔ ایک زمانے میں انہیں مشاعروں میں نظامت کرنے کا شوق ہوا۔ اللہ نے شخصیت اور آواز میں دم دیا تھا اور سونے پر سہاگہ ان کے استاد بھائی ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد اس میدان کے مرد کامل تھے۔ کچھ احباب کے اصرار پر وہ اس میدان میں بھی اتر آئے۔ میرٹھ، بلند شہر اور دوسرے کئی شہروں میں ہم نے بھی انہیں شاعر کے علاوہ بحیثیت ناظم بھی مدعو کیا۔ ان دنوں لکھنؤ میں والی اسی نے کچھ پاکستانی شاعروں کے مجموعے شائع کیے تھے۔ شکیب جلالی ان کے پسندیدہ شاعر تھے ان کا تقریباً تمام مجموعہ انہیں از بر تھا۔ دوران نظامت شکیب جلالی کے اشعار بے دریغ نیا کرتے تھے۔ مگر دو چار مشاعروں کی نظامت کے بعد ہی انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ ذاکری الگ شعبہ ہے اور مشاعرے کی نظامت ایک بالکل ہی الگ دنیا ہے اس میں تنگم سے زیادہ تکلم کا کمال دکھانا ہوتا ہے اور بچ پوچھیے تو ان کے علمی و ادبی کاموں اور تنقیدی و تحقیقی کارناموں کے بوجھ تلے ان کا شاعر دبتا ہی چلا گیا۔ ایسے ہی ناجائز کتنے نام ہیں آل احمد سرور، محمود الہی، قمر رئیس۔ اس لیے شاعری بقول گوپال متل پورے مرد کی متقاضی ہوتی ہے۔

جنوری 1986 میں راجستھان ہایئر ایجوکیشن سروسز کے تحت میرا تقریر بحیثیت لیکچرر ہاں ہو گیا۔ میں نے انہیں خط لکھ کر مشورہ چاہا کہ مجھے راجستھان کے کس شہر کا انتخاب کرنا چاہیئے۔ ان کا تفصیلی جواب آیا لکھا کہ ویسے تو راجستھان کا ہر ذرہ اپنی مثال آپ ہے مگر آپ کے لیے کوئی بہتر رہے گا اس لیے کوئی نہ دہرے دون ایکپریس اور فٹنیر میل ہر دن میرٹھ کے لیے جاتی ہیں اور اس طرح تم اپنے والد کی خبر گیری کا فریضہ بھی ادا کر سکو گے۔ میں نے ان کے مشورے پر لبیک کہا اور کوئی نہ کے پوسٹ گریجویٹ شعبہ اردو کو جان کر لیا۔ پورے چھ مہینے برس کوئی نہ میں بسر ہوئے، پوری جوانی کوئی نہ میں گزری مگر وطن مالوف سے بھی تعلق برقرار رہا۔ فضل امام صاحب کا مشورہ بہت سودمند ثابت ہوا۔

1986 میں انجمن کل ہند ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی کا سال تھا۔ دہلی میں قمر رئیس صاحب کی سرپرستی میں سہ روزہ عالمی کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا۔ قمر رئیس صاحب کا خیال تھا کہ صوبائی انجمنوں کو بھی اپنے یہاں کانفرنسوں کا انعقاد کرنا چاہیئے۔ راجستھان انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ کی جانب سے اس باگراں کو اٹھانے کی ذمہ داری انہوں نے اپنے سر لے لی۔ وہ صوبائی شاخ کے صدر تھے۔ پروفیسر فیروز احمد جنرل سیکریٹری اور میں سیکریٹری۔ انہوں نے راجستھان کے تمام سرکردہ ادیبوں اور شاعروں کو انجمن ترقی پسند مصنفین سے جوڑ لیا تھا۔ 18، 19 اکتوبر 1986 کو بے پور میں راجستھان انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا۔ قمر رئیس صاحب کا حکم تھا کہ میں 17 اکتوبر کو ہی بے پور پہنچ جاؤں تاکہ فضل امام صاحب اور فیروز صاحب کا ہاتھ بٹاسوں۔ میں مسلم مسافرانے میں مقیم تھا۔ جہاں اس زمانے میں راجستھان کے تمام ادباء و شعراء قیام کیا کرتے تھے، ایک طرح سے وہ راجستھان کے ادباء و شعراء کا میٹنگ پوائنٹ تھا۔ قمر رئیس صاحب نے یہ بھی لکھا تھا کہ ہم سب دہلی سے احمد آباد میل سے بے پور کے لیے روانہ ہوں گے۔ مجھے علم تھا کہ احمد آباد میل صبح سویرے بے پور پہنچ جاتی ہے۔ میں بروقت اسٹیشن پہنچ گیا مجھ سے پہلے وہاں پروفیسر فیروز احمد صاحب مہمانوں کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ دہلی سے قمر رئیس صاحب کے ہمراہ پروفیسر عتیق اللہ اور پروفیسر صادق بھی ٹرین سے پرآمد ہوئے۔ یہ قمر رئیس صاحب کا کمال تھا کہ وہ لوگوں کو جوڑنا جانتے تھے۔ ان کی شخصیت کی سادگی سب کا من موہ لیتی تھی۔ نوجوانوں میں ارقی کریم اور ابن کنول اور کئی دوسرے بھی آئے تھے۔ فیروز احمد صاحب کچھ متفکر

سے تھے۔ استفسار پر انہوں نے بتایا کہ ترقی پسندوں کی اس کانفرنس کے مخالفین نے شہر میں پمفلٹ بٹائے ہیں اور یہ پرچار کیا جا رہا ہے کہ منکرین خدا اور اسلام مخالف لوگوں کی کانفرنس ہے ان کا فکرمند ہونا سب کا تھوڑی دیر میں فضل امام صاحب بھی تشریف لے آئے دوران گفتگو انہوں نے تمام مسائل کو اپنے قبضوں میں اڑا دیا۔ بولتے وقت انہیں الفاظ دہرانے کی عادت تھی۔ کہنے لگے ہم کربلائی ہیں انقلاب کے جویا اور حسین کے پرستار ہیں۔ ہم کسی سے ڈرنے دینے والے نہیں ہیں۔ ان کی دیکھ ریکھ میں دو روزہ یادگار کانفرنس منعقد ہوئی۔ تمام سرمائے کا بندوبست بھی انہوں نے کیا تھا۔ اس کانفرنس میں مذکورہ بالا اصحاب کے علاوہ سردار جعفری جیسی عظیم المرتبت شخصیت بھی موجود تھی۔ علی احمد فاطمی، پروفیسر فصیح ظفر، پروفیسر محمود الحسن بھی تشریف لائے تھے۔ راجستھان کے ادیبوں میں ڈاکٹر سعید الرحمن نیازی، ڈاکٹر رفعت اختر خاں، سید معظم علی، ممتاز شکیب، ڈاکٹر روشن اختر کاظمی، ڈاکٹر مدبر علی زیدی، ڈاکٹر ابوالفضل عثمانی بے پور کی سرکردہ علمی اور ادبی شخصیت انعام الحق سے بھی ان کا یار تھا اور اس کانفرنس میں انعام الحق صاحب نے بہت کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ کانفرنس کے تمام شرکاء اور مندوبین کی ضیافت کا اہتمام انعام الحق صاحب کی کوٹھی پر ہوا تھا۔ جس میں کئی سولوگوں نے شرکت کی تھی۔ رات کو ان کی کوٹھی کے وسیع صحن میں محفل مشاعرہ بھی سبائی گئی تھی۔ انعام الحق صاحب کے انتقال کے بعد اب بے پور میں اردو کا الیاسیاتی ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا۔ فضل امام صاحب کی سرگرمی، سرکردگی اور سربراہی قدم قدم پر جلوہ گر ہو رہی تھی۔ سب ان کے حسن انتظام کی داد دے رہے تھے دوسرے دن شام کو تمام مہمان رخصت ہو گئے۔ ابن کنول اور ارقی کریم کہنے لگے ہم کل جائیں گے۔ آج تم ہمیں بے پور سیر کے لیے لے چلو۔ رات کا وقت تھا ہم سب پیدل ہی مرزا اسماعیل روڈ پر چلے جاتے تھے کہ سامنے سے شیروانی میں ملبوس ایک صاحب کو برقعر پوش خاتون کے ساتھ ایک رکشا پر آتے ہوئے دیکھا۔ دل کو یقین نہیں ہوتا تھا کہ دن میں جس شخص کو سوٹ اور ٹائی میں دیکھا تھا وہ اب رات کو شیروانی میں۔ رکشا قریب آیا تو یقین پیچھے ہوا کہ فضل امام صاحب ہی ہیں۔ وہیں رکشا پر سے زور سے بولے اے بھئی! دن میں ہو گئی ترقی پسندی، اب ہم مجلس میں جا رہے ہیں، حسین کی بارگاہ میں۔ یہ تھے ہمارے فضل امام صاحب۔ اسی سال انہوں نے الہ آباد کے لیے رخت سفر باندھا۔ وہاں پہلے ریڈر اور بعد میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ مگر ان کی شخصیت پر جو بہار راجستھان کے صحراؤں میں آئی تھی وہ لگا جتنا کے سرسبز و شاداب علاقوں میں میسر نہ ہو سکی۔ حالانکہ اتر پردیش ان کے بزرگوں کی سرزمین تھی بعد میں وہ اتر پردیش کے چیف منسٹر ملائم سنگھ سے قربت کے سبب اتر پردیش بورڈ آف سکیورٹی ایجوکیشن کے چیئرمین بھی مقرر ہوئے اور انہیں وزیر کا درجہ دیا گیا تھا۔ لیکن ان کے جانے سے راجستھان ایک جوہر قابل سے محروم ہو گیا۔ جس سے لوگوں کو بہت امیدیں تھیں۔ راجستھان یونیورسٹی کا شعبہ اردو اور فارسی ان کے بعد اس ادبی گہما گہمی سے محروم ہو گیا جس کی ضرورت اردو والوں کے لیے از حد ضروری ہے۔ مگر راجستھان ان کے دل میں بسا ہوا تھا اس رشتے کو مزید مضبوط کرنے کے لیے انہوں نے اپنی ایک بیٹی کی شادی بے پور میں کی۔ ان کے داماد ڈاکٹر علی حسن بہت خوش مذاق اور قابل انسان ہیں۔ انگریزی ادب کے لیکچرر ہیں اور میرے حلقہ احباب میں شامل ہیں۔

پروفیسر فضل امام کی پیدائش ۷ اگست ۱۹۳۰ء کو ضلع اعظم گڑھ کے موضع بہاء الدین پور میں ہوئی تھی۔ یہ ایک علمی و ادبی خاندان تھا۔ ان کے والد سید مشتاق حسین رضوی جو ریل کے محکمے میں ملازم تھے اردو و فارسی ادب سے واقفیت رکھتے تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم اس زمانے کے رواج کے مطابق مدارس میں ہوئی۔ ایم اے کی ڈگری آگرہ یونیورسٹی سے حاصل کی۔ اور پی ایچ ڈی کے لیے اردو کے نام ور ادیب اور نقاد پروفیسر محمود الہی کی نگرانی میں تحقیقی مقالہ قلم بند کیا۔ ان کے مقالے کا موضوع امیر اللہ تسلیم حیات اور کارنامے تھا۔ ایک تو محمود الہی جیسے صاحب فہم و فراست

کی نگرانی، دوم فضل امام جیسا زیرک ریسرچ اسکالر۔ اس تحقیقی مقالے نے جہاں امیر اللہ تسلیم کی شخصیت اور ان کے شرعی محاسن کی بازیافت کی وہیں فضل امام صاحب کی قدر و قیمت میں بھی اضافہ ہوا اور وہ ادبی حلقوں میں ایک بالغ نظر نقاد تسلیم کیے جانے لگے۔ اس کے بعد تو ان کے قلم سے ایک سے بڑھ کر ایک ادبی کارنامے منظر عام پر آئے جس کی بدولت ان کی شہرت میں اضافے کے ساتھ اردو کا دامن بھی ان کی علمی و ادبی فتوحات سے بھرنے لگا۔

مرحوم کی تدریسی زندگی کا آغاز بلرام پور مہاراجہ کی یاد میں قائم شدہ کالج سے ہوا۔ وہ وہاں کئی برس تک اردو زبان و ادب کی تدریس سے وابستہ رہے۔ ان کی زندگی میں ایک زبردست تبدیلی اس وقت آئی جب انہوں نے راجستھان یونیورسٹی کے شعبہ اردو و فارسی سے وابستگی اختیار کر لی۔ راجستھان میں ان کا قیام دو دہائی سے کچھ کم برس تک رہا۔ مگر یہ عرصے ان کے لیے بھی اور اہل راجستھان کے لیے بھی اردو زبان و ادب کی تدریس کے ساتھ ساتھ اس کی ترویج کے لیے بھی بہت سودمند ثابت ہوا۔ راجستھان میں ان کی آمد تنازعہ ہوا کہ اس کے لیے جو کچھ جیسے پشمرہ کو پٹیلوں میں جان پڑ گئی ہو۔ راجستھان یونیورسٹی کی راہ دار یاں اردو کے طلبہ و طالبات سے پڑ جو گئیں۔ مذا کروں، مباحثوں، مشاعروں اور سیمیناروں کی ایک نئی دنیا آباد ہوئی۔ 1986 کی گرمیوں میں انہیں الہ آباد یونیورسٹی سے بلاوا آیا اور وہ وہاں کے شعبہ اردو میں پہلے ریڈر اور بعدہ پروفیسر مقرر ہوئے۔ وہاں کے ادبی حلقوں میں بھی ان کی خوب پذیرائی ہوئی۔ ہندی اور اردو دونوں زبانوں کے ادیبوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مگر وہ چمک کبھی کبھو گئی تھی جس کی بدولت راجستھان کے ادبی صحراؤں میں بہار اگھئی تھی۔ اس ویران میکدے کا نصیب ابھی سنورنے لگا تھا، جو انہوں نے الہ آباد جا کر حاصل کیا۔ سو یہ وہ انہیں یہاں بھی حاصل ہو جاتا مگر کبھی فیصلوں کی نفیاتی تہہ میں اترا نہ بہت مشکل ہوتا ہے۔ حالانکہ جانے سے قبل وہ یہاں کے شعبہ اردو و فارسی کو پوری طرح ایک مخصوص علمی و ادبی رنگ میں ڈھال چکے تھے۔ اداروں اور تنظیموں کی اہمیت اپنی جگہ مگر کبھی مرتبہ ان کی شناخت اشخاص سے ہوتی ہے۔ بے پور سے ان کے جانے کے بعد پروفیسر فیروز احمد نے بہت سنبھالا۔ تنقید و تحقیق کے میدان میں شعبے کی شناخت کل ہند سطح پر ہوئی۔ مگر پروفیسر فیروز احمد کی سبکدوشی کے بعد وہاں راہ دار یاں سوئی پڑی ہیں۔ یہی حال اودے پور یونیورسٹی کے شعبہ اردو کا ہے۔ جہاں پروفیسر شاقب رضوی جیسا جدید عالم شعبہ اردو سے وابستہ تھا۔ صوبے کے پہلے وزیر اعلیٰ مومن لال سکھاڑیا بھی ان کے قدردانوں میں تھے۔ وہ خوبصورت شہر اردو کی محاسن سے خالی سا ہو گیا ہے۔ یہی حال بے پور کا ہے۔ زیادہ لکھوں گا تو لوگ ناگواری کا احساس کریں گے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اردو والے اردو کے قاتل ہیں۔ بالخصوص اردو تدریس سے وابستہ افراد جو شعبہ ہائے اردو میں تعیناتی کے بعد خود کو خدا کا وارث سمجھنے لگتے ہیں اور طلبہ کے ساتھ غلاموں سے بھی بدتر سلوک روا رکھتے ہیں۔ مستثنیات ہر جگہ ہوتی ہیں مگر مجھے کہنے دیجئے اکثریت ایسوں کی ہی ہے۔

شعبہ اردو والہ آباد یونیورسٹی سے سبکدوشی کے بعد فضل امام صاحب لکھنؤ منتقل ہو گئے تھے۔ بہت پرسکون زندگی گزار رہے تھے۔ دمہ کا مرض تو انہیں پہلے سے تھا۔ شوگر کی زیادتی البتہ بہت پریشان کرتی تھی مگر ایسا کچھ نہیں تھا کہ یوں رخت سفر باندھ لیں گے۔ چند روز قبل ہی لکھنؤ کے کسی اسپتال میں داخل ہوئے اور کچھ روز کی علالت کے بعد ہی 13 اگست 2020 کو داعی اہل کو لبیک کہہ دیا۔ اگست میں ہی وہ اس جہان فانی میں وارد ہوئے تھے اور اگست ہی میں اس دنیا کو خیر آباد کہہ دیا۔ کل اسی برس کی عمر پائی۔ اپنے پیچھے چار بیٹوں اور تین بیٹیوں نیز نواسی اور نواسوں پر مشتمل ایک بھرا پورا خاندان چھوڑ گئے۔ رہے نام اللہ کا۔۔۔ اپنے ایک قلعہ میں انہوں نے خود ہی اعتراف کیا تھا۔

جانے والے کو کہیں روک سکا ہے کوئی
پھول برساؤ گے کیا آگ لگا کر جاؤ
مجھ سے مانگے نہ کہیں میری متنا تجھ کو
اپنے دامن سے چراغوں کو بجھا کر جاؤ

پروفیسر فضل امام رضوی کے علمی و ادبی کارناموں کی فہرست خاصی طویل ہے۔ مگر ان کی جن تصانیف نے مجھے بے انتہا متاثر کیا ان میں امیر اللہ تسلیم پر تحریر کردہ ان کا تحقیقی مقالہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کا طرز استدلال ان کے تحقیقی مرتبے کو بلند بالا قرار دینے کے لیے کافی ہے۔ ان کے اس تحقیقی کارنامے سے امیر اللہ تسلیم کی شخصیت اور کلام پر پڑا ہوا گرد و غبار اس طرح صاف ہوا کہ لوگ تسلیم کے مرتبے سے واقف ہوئے۔ ان کے اس کام کا اعتراف اتر پردیش اردو اکادمی نے انعام سے نوازا کر کیا۔ میر انیس کی شخصیت اور ان کے فن کے تعین قدر میں ان کا ڈی لٹ کا مقالہ انیس کی شخصیت اور فن بڑی قدر و قیمت کا حامل ہے۔ انہیں یہ بھی اعزاز حاصل ہے کہ راجستھان کے اردو والوں میں وہ پہلے ڈی لٹ ہیں۔ جوش ملیح آبادی پر ان کی تصنیف شاعر آخر الزماں ان کی جوش تئیں عقیدت کی مظہر بھی ہے اور عصر حاضر میں جوش شناسی کے میدان میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ میرے نزدیک بھوج پوری زبان و ادب کا تعارف، تاریخ اور اردو سے اس کے لسانی رشتے کی اہمیت پر اس سے قبل اس طرح غور و فکر نہیں کیا گیا تھا۔ راجستھانی زبان و ادب کی تاریخ لکھ کر انہوں نے دوسروں کے لیے راستہ ہموار کیا۔ مجھے کہنے دیجئے کہ پروفیسر فیروز احمد کو راجستھان اور اردو کے لسانی روابط پر غور و فکر کرنے کی تحریک شاید ان کی اس تصنیف سے ہی ملی ہو۔ یقیناً پروفیسر فیروز احمد نے ایک ضخیم کتاب اس موضوع پر لکھ کر ماہرین لسانیات کو اردو کی ابتدا کے مختلف نظریات پر غور و فکر کی دعوت دی ہے۔ پروفیسر فضل امام کے جانے سے راجستھان اور اتر پردیش دونوں صوبوں کے علمی و ادبی حلقوں میں صفت ماتم بچھی ہوئی ہے۔

□□□

لکھنؤ ایجنسی

ماہ نامہ نیادور کے وہ قارئین جو اس کے مستقل
ممبر نہیں ہیں اگر وہ نیا دور کی خریداری کے
خواستگار ہیں تو لکھنؤ میں ان مندرجہ ذیل ایجنسیوں
سے رابطہ کریں۔

دانش محل:

این آباد لکھنؤ۔ 9792361533

عرش پبلیکیشنز:

خواجہ ثاور، وکٹوریہ اسٹریٹ، چوک لکھنؤ۔ 9935915110

صبیحہ انور

نامی پریس بلڈنگ، نجاس، لکھنؤ

9839132270



سہیل نامہ۔ کارنامہ

سہیل کا کوروی ایک اسم با مسمی شخصیت کا نام ہے۔ سہیل ستارہ ہے رات کے اندھیرے میں روشنی کا پیامبر۔ چھوٹے بڑے دیووں ستارے چمک رہے ہیں۔ (پہلے آسمان پر سیکڑوں ہوا کرتے تھے میں نے گننے کی بھی کوشش کی ہے)۔ اگر آپ آسمان پر غور سے نظر میں جمائیں تو رات جتنی بھی اندھیری ہو آپ کہیں نہ کہیں ایک مناسا ستارہ ڈھونڈ لیں گے۔ جو دھیرے دھیرے ہلکیں جھپکاتا جانتا نظر آتا ہے۔ اس کو دیر تک دیکھئے اور پھر وہ ستارہ شوق سے ہمک کر زیادہ بلکہ سب سے زیادہ چمک اٹھتا ہے۔ اور اپنی دھیمی دھیمی چمک سے توجہ بانٹتا رہتا ہے۔ میرا یہ بیان شاید آپ کو شاعرانہ لگے مگر سہیل جنہیں آپ ہم سب سہیل کا کوروی کہتے ہیں ان پر یہ بیان پورا تر تا ہے۔ میں نے سہیل کو ان کے بچپن سے دیکھا ہے۔ مجھ سے عمر میں چھوٹے ہیں اور میں نے ہمیشہ ان کو اپنے سے چھوٹا سمجھا ہے۔ ان کے والد معین الدین حسن صاحب امیر الدولہ اسلامیہ کالج میں انگریزی کے لکچرر تھے اور اس سے پہلے میرے والد وجاہت علی سندیلوی صاحب کے دوست تھے۔ کرچھن کالج میں والد سے سینئر تھے۔ میری دادی کا انتقال والد کی نوعمری میں ہو گیا تھا، سات بڑی بہنوں کے اکلوتے بھائی والد کے حد سے زیادہ دلارے اور لاڈ لے تھے۔ لکھنؤ میں معین صاحب خود بخود دوست سے زیادہ والد کے انچارج بن گئے۔ والد صاحب جنھیں میں میاں جان کہتی تیا تے تھے کہ معین صاحب کی اپنے گھر میں بے حد قدر و منزلت تھی۔ وہ بھی اپنی خاندان کی چہیتی اولاد تھے۔ لیکن اگر میاں جان معین صاحب کے گھر پہنچ جائیں تو معین صاحب پکار کر گھر میں اطلاع کر دیتے۔ ”امی وجاہت آئے ہیں“ گھر والوں کے لئے یہ ایک خبر تھی کہ وہ وجاہت کے لئے شربت اور دوسرے لوازمات تیار کریں۔ انتہائی کالج میں امتحان کے دوران معین چچا ہسٹری کے پیپر با آواز بلند پڑھتے کہ وجاہت سن لیں۔ وجاہت آنکھ بند کر سنتے رہتے۔ معین صاحب چپک کر لیتے کہ وجاہت سو تو نہیں گئے۔ میاں جان کی بے پروائی بد نوازش بھی ہوتے۔ میرے والد ایک لبرل، آزاد خیال مذہبی اور ملکی آویز شوں سے آزاد جوان تھے۔ یہ آزادی آخر عمر تک برقرار رہی۔ ان کی بھنوں اور باتوں پر معین صاحب با آواز بلند دعا میں کرتے۔

”اے اللہ سے معاف کر دینا یہ بڑا معصوم اور نیک بندہ ہے۔ تھوڑا سا باغی مزاج ہے تو اس پر رحم کرنا اسے معاف کر دینا“۔ معین چچا ہم سے کہتے ”تمہارا باپ ہمارا پرانا دشمن ہے۔ بہت عاجز کیا زندگی بیتی کر دی تھی۔“

اس زمانے میں صلیبی جنگوں سے متعلق انگریزی فلمیں مے فیر سینما ہال میں حضرت گنج میں لگتی تھیں۔ مے فیر کا ماحول خاصہ انگریزی اور پاش تھا۔ دیکھنے والے زیادہ تر گورے اور ثانی ہوتے۔ ماحول بہت شانہ ہوتا۔ سب دوست معین صاحب کو بیچ میں بٹھاتے اور خاموش رہنے کی تاکید کرتے رہتے مگر کیا مجال کہ فلم کے دوران معین صاحب ایک آدھ بار اللہ اکبر اور نعرہ تکبیر اللہ اکبر کا نعرہ نہ لگائیں۔ سینما کے اہل کار اندھیرے میں لپکتے۔ ہر بار معین صاحب سے وعدہ لیا جاتا کہ وہ آئندہ ایسی حرکت نہ کریں گے۔ ایک مشہور فلم صلاح الدین ایوبی کے کسی جنگی معرکے کے بارے میں تھی۔ عرصے سے اخباروں میں اور شہر میں اس فلم کا چرچا تھا۔ سب دوستوں نے فلم کا پروگرام بنایا بس معین صاحب کا ساتھ ہونا اور سینما لٹا بیٹھی کھیر تھا۔ سب جانتے تھے کہ صلاح الدین ایوبی معین صاحب کی کمزوری ہے۔ معین صاحب کافی دیر خاموش بیٹھے رہے۔ مگر جیسے ہی بڑے پردے پر اونچے گھوڑے پر سوار ہوتے شاندار اسلوں سے سجے ایک مرد مومن کو لے کر چھلانگ لگا ئی۔ معین صاحب کا سینما لٹا مشکل ہو گیا۔ سیٹ پر کھڑے ہو کر نعرہ تکبیر اللہ اکبر کے نعرے لگانے شروع کر دئے۔ جوش ایمانی اپنے عروج پر تھا جو بھی روٹھنا کسی کی خیر نہیں تھی۔ آواز رنجی ہوئی تھی۔ نتیجے میں پوری ٹولی سینما ہال سے باہر کر دی گئی۔ سب دوست مے فیر کے برآمدے میں شرمندگی کا پسینہ پونچھ رہے تھے۔ سب نے طے کر لیا کہ اب ان کے ساتھ کبھی فلم نہیں دیکھیں گے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اگلی بار فلم دوداس دیکھنے گئے تو وجیب میں دو رومال لے کر گئے۔ دوستوں کو تاکید تھی کہ رومال ضرور رکھ لینا۔

”سہیل کا کوروی اور ان کی کتاب سہیل نامہ پر بات کرتے کرتے ان کے والد کی بات کرنے لگی، کیونکہ میں نے سہیل کو اسی مخلص، درد مند اور مددگار ہستی کے حوالے سے ہی جانا تھا۔ اس وقت سے جب سہیل اپنے والدین کے صاف ستھرے میاں پوت بن کر جاتے رہتے معین صاحب کالج کی چھٹیوں میں سندیلے اپنی بیگم اور بیٹے کے ساتھ تشریف لاتے۔ سہیل میں محبت، رفاقت اور دردمندی کے اجزائے باگل شستم کا ہی نتیجہ ہیں۔ مخلص، ملنسار اور منکسر المزاج سہیل نے اس حوالے کو اسی طرح برقرار رکھا ہے، مہینوں ملاقات نہیں ہوتی مگر جب ملتے ہیں تو اسی گرم جوشی سے کہ خود اپنی کوتاہیوں پر شرم آتی ہے۔ ہر بات بڑی سعادت مندی سے سنتے ہیں۔ سردیوں میں ملے تو سردی میں نہ گھومنے کی تاکید کر دی۔ اگر گرمیوں میں فون آیا تو ”باہر نہ نکلتا گھر میں بیٹھو دھوپ بہت تیز ہے“ کی نصیحت کر دی۔ انھوں نے سر جھکا کر سن لی۔ نرمی اور شائستگی سہیل کی طبیعت کا خاصہ ہے۔“

غزل

راحت دل دعا دے آج مجھے
راس آئے کوئی علاج مجھے

خیریت پوچھتا تو کیا ہوتا
چھو رہا ہے ترا مزاج مجھے

میری کوشش صلاح کی پابند
تو سکھاتا ہے احتجاج مجھے

عشق تیری ادائیگی کیا ہے
کھا رہا ہے ترا خراج مجھے

بیچ کر سب جسے خرید لیا
بیچ آیا وہی رواج مجھے

کل تماشا میں اس کا دیکھوں گا
جس نے سمجھا مذاق آج مجھے

میں اندھیروں کا پاس دار نہیں
جانتے ہیں سبھی سراج مجھے

غم گساروں نے دے دیا منظور
زخم سینے کا کام کاج مجھے

ڈاکٹر احمد منظور

چند سہ ماہہ مکالمہ

7006345309

سہیل کا کوری اور ان کی کتاب سہیل نامہ پر بات کرتے کرتے ان کے والد کی بات کرنے لگی، کیونکہ میں نے سہیل کو اسی مخلص، دردمند اور مددگار دوستی کے حوالے سے ہی جانا تھا۔ اس وقت سے جب سہیل اپنے والدین کے صاف ستھرے میاں پوت بن کر جاتے رہتے معین صاحب کالج کی چھٹیوں میں سندیل اپنی بیگم اور بیٹے کے ساتھ تشریف لاتے۔ سہیل میں محبت، رفاقت اور دردمندی کے اجزا مدتے باگل مستم کا ہی نتیجہ ہیں۔ مخلص، ملنار اور منکر المزاج سہیل نے اس حوالے کو اسی طرح برقرار رکھا ہے، مہینوں ملاقات نہیں ہوتی مگر جب ملتے ہیں تو اسی گرم جوشی سے کہ خود اپنی کوتاہیوں پر شرم آتی ہے۔ ہر بات بڑی سعادت مندی سے سنتے ہیں۔ سردیوں میں ملے تو سردی میں نہ گھومنے کی تاکید کر دی۔ اگر گرمیوں میں فون آیا تو ”باہر نہ نکلنا گھر میں بیٹھو دھوپ بہت تیز ہے“ کی نصیحت کر دی۔ انھوں نے سر جھکا کر سن لی۔ زنی اور شائستگی سہیل کی طبیعت کا خاصہ ہے۔

یہ میں نے کہیں اور بھی لکھا ہے کہ انسان پر مختلف اوقات میں طاری ہونے والی کیفیات میں بہت اہم اور ضروری کیفیت حیرت کی ہے۔ اگر ہم پر طاری ہماری کیفیات سے حیرت کو ہٹا دیا جائے تو یہ دنیا بے مزہ، اندھیری اور سنسان ہو جائے گی۔ حیرت زندگی کو وہ رنگارنگی دیتی ہے جو ہمیں زندہ رکھتی ہے۔ سہیل نے ہمیں کئی بار حیرت زدہ کیا ہے۔ ندرت طبع اور جدت خیالی سہیل کو سہیل بناتی ہے۔ دانتوں تلے انگلی دبانے والی کراماتی خوبی سہیل کو سب سے الگ کرتی ہے۔ پتہ نہیں کہاں کہاں سے نئے نئے دماغ میں آتے ہیں۔ یوں تو سہیل کی تقریباً بیس کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس سلسلے میں کئی کتابیں عجیب وغریب خوبیوں سے مزین ہیں۔ آم نامہ۔ آم پر تقریباً سات سو اشعار پر مشتمل کتاب ہے۔ 2015 میں آم نامہ لکھا کہ آف رکارڈس میں شامل ہے۔ روزمرہ اور محاوروں پر چھ سو اشعار لکھے گئے ہیں۔ محاورے اور ضرب المثل جو ہماری بول چال سے ختم ہو رہے ہیں ان کو خوبصورتی سے اشعار میں پرو کر سہیل نے ایک تہذیبی کارنامہ انجام دے دیا ہے۔

”نیلا چاند“ یا پھر ”تفحیل نو“ غالب کی زمین میں ”ارضیات غالب“ اس کے بعد سہیل نامہ منظوم خود نوشت سہیل کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ خود نوشت لکھنا اور پھر منظوم!! جہاں گزری بیتی زندگی کو دہرانا، یادوں کے بے پناہ سیلاب کو ضابطے میں لانا اور بیان کرنا، بہت مشکل رہا ہوگا۔ شاید ان کی ہشت پہل سرشت انہیں ایک جگہ قرار سے بیٹھنے نہیں دیتی ہے۔ یہ سہیل کی محبت ہے کہ سردی کے کرکڑاتے موسم میں سہیل خود مجھے کتاب دینے آئے۔ غیر افسانوی تحریروں میں خود نوشت میری پہلی پسند ہے، اس سے مجھے خوشی و دلچسپی ہے۔ سہیل نامہ بھی میں نے ذوق و شوق سے پڑھا۔ سہیل نامہ سہیل کی سادگی، انکساری، وسیع قلبی کی داستان ہے۔ جو کسی تعارف یا حوالے کی محتاج نہیں۔ اس میں نہ نمائش ہے نہ ریاکاری نہ خود پسندی نہ قد کو اونچا کرنے والی بیساکھیاں، نہ اپنے شاندار اور پر شکوہ پس منظر کا سہارا لیا ہے، نہ ہی اپنی بشری کمزوریوں اور نادانیوں کو چھپانے کا عذر۔ اپنے خوف اور جھجک کے وقت قلندر صفت درویش سرشت سہیل کو آ پار دیکھا جاسکتا ہے۔

خود نوشت میں سچائی سب سے مشکل سمجھی ہے۔ چونکہ تحریر کا تانا بانا جن کے گرد بننا جاتا ہے اور جو بیٹتا ہے دونوں ایک ہوتے ہیں اور ڈنڈی مارنے کی گنجائش زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لئے ہر لکھنے والا خود نوشت لکھنے کی جرات نہیں کرتا۔ کیونکہ اکثر دیانت دار حقیقت کو افسانہ نہیں بناتے۔ کبھی کبھی ہمارا طرز فکر اور تہذیبی حصار جگہ جگہ حائل ہوتا ہے۔ سہیل نے بڑی ایمانداری اور بہادری کے ساتھ زندگی کی بند مٹی کھول دی ہے۔ فن کے حوالے سے اتنا ضرور کہوں گی کہ خوشبو، رنگ، تشبیہیں استعارے کی دوسری اصناف میں گنجائش ہے۔ زندگی کی مربوط روداد کو قلم بند کر کے یہ تمام فنی لطافتیں طاق پر رکھنا پڑتی ہیں۔ یہاں بیان کی رنگینی ممکن نہیں۔

یہ صاف گوئی سے لکھی گئی تحریر ہے۔ یقین ہے کہ سہیل نامہ کا شمار لکھنو کی تہذیبی تاریخ کی دستاویزات میں ہوگا۔ لکھنوالوں کی ایسی رواداری جذباتی ہم آہنگی کی یہ ایک مثال ہوگا۔ یہ ایک ایسا تہذیبی مرقع ہے جو کسی مصور کے بس کی بات نہیں۔ یہ ایک ایسا کارنامہ ہوگا جو حیرت کے ساتھ ساتھ اہل لکھنو اور کوری شریف کے لئے باعث فخر ہوگا۔

□□□

ڈاکٹر علی حمیدی

موضع و پوسٹ مگرن، ضلع پریاک راج

8417802059



مالک رام کی خاکہ نگاری

نام مالک رام بوجی قلمی نام ’’ناٹھ رام‘‘ جس کو ماہر القاری نے تجویز کیا تھا۔ پیدائش ضلع گجرات (پاکستان) کے قصبہ پھالیہ میں ۲۲ دسمبر ۱۹۰۶ء کو کھتری خاندان میں ہوئی۔ والد کا نام لالہ نہال چند تھا جو اپنے بھائیوں بہنوں میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ تھے۔ اور انگریزی حکومت میں فوج کے محکمہ کمشنریٹ میں ملازم تھے۔ والدہ کا نام بھگوان دیوی تھا جو بہت نیک سیرت اور حوصلہ مند خاتون تھیں۔ شوہر کے انتقال کے بعد اپنی زندگی کے آخری ایام تک یہ مالک رام کے ساتھ رہیں۔

مالک رام کی ابتدائی تعلیم سکھوں کے گرو دوارہ میں ہوئی۔ جہاں انھوں نے استاد گرتھی بگت سنگھ سے گودھی، پنجابی لکھنا پڑھنا سیکھا اور سکھ مذہب کے مقدس بانیوں جیسے جپ جی، کیرتن، راہ راس، سکھنی، سوبلا وغیرہ کا مطالعہ کیا اور اس کو ہمیشہ کے لئے حفظ کر لیا۔ گرو دوارہ میں مزید تعلیم حاصل کرنے کا کوئی بندوبست نہ تھا اس لئے ان کی ماں نے اپریل ۱۹۱۲ء میں ان کو رونا پور ملٹر اسکول پھالیہ میں داخل کرایا جہاں سے ۱۹۲۰ء میں انھوں نے ملٹر کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد وکٹوریہ ڈائمنڈ جلی بانی اسکول وزیر آباد ضلع گجرانوالہ سے ۱۹۲۲ء میں جونیئر اور سینئر امتحان پاس کیا اور اسی اسکول سے ۱۹۲۳ء میں بانی اسکول کیا۔ پھر ۱۹۲۶ء میں گجرات گورنمنٹ انٹر کالج سے انٹرفرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ اس کے بعد ڈی۔ اے۔ وی کالج لاہور سے ۱۹۲۸ء میں بی۔ اے۔ بھی فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ اور پھر گورنمنٹ کالج لاہور سے ۱۹۳۰ء میں ایم۔ اے۔ کی ڈگری حاصل کی۔ اتفاق سے اسی سال پنجاب یونیورسٹی نے ملازم پیشہ لوگوں کے لئے کالج میں وکالت کی تعلیم دینے کے لئے ایویٹنگ کالیر سکول دیئے۔ جس کا فائدہ اٹھا کر مالک رام نے اسی کالج سے ۱۹۳۳ء میں وکالت کی ڈگری حاصل کر لی۔ جب کہ وکالت کا پیشہ بھی اختیار نہیں کیا محض علم میں اضافے کے مقصد سے ڈگری حاصل کی تھی۔ مالک رام نے اپنی ملازمت کا آغاز ماہ نامہ ’’نیرنگ خیال‘‘ کے نائب مدیر کی حیثیت سے کیا۔ جہاں انھوں نے اپنی تندرستی و محنت سے کام کیا جس کے نتیجے میں ان کو ساٹھ روپیہ ماہانہ ملتا تھا۔ ۱۹۳۲ء سے لے کر ۱۹۳۴ء تک یہ ’’نیرنگ خیال‘‘ کی ادارت سے وابستہ رہے۔ اسی ملازمت کے دوران آریہ پرادیٹنگ پریس تیندھی بسوا کا ہفت روزہ اخبار ’’آریہ گزٹ‘‘ لاہور سے بھی وابستہ ہو گئے۔ یہاں بھی ان کو ساٹھ روپیہ ماہانہ ملنے لگا۔

آریہ گزٹ سے استعفیٰ دینے کے بعد ۱۹۳۵ء میں ایک ماہ ریڈیو دہلی میں کام کیا۔ پھر جنوری ۱۹۳۶ء میں روزنامہ ’’بھارت ماتا‘‘ سے وابستہ ہوئے جہاں ان کی تنخواہ ۵۷ روپے ماہانہ مقرر کی گئی تھی۔ اس اخبار میں چھ ماہ کی مدت تک بی کام کرنے پائے تھے کہ یہ اخبار بھی بند ہو گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو ذریعہ معاش کے لئے دوسرا راستہ اختیار کرنا پڑا۔ چنانچہ جون ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۷ء تک غازی طور پر حکومت ہند کے پبلک انفارمیشن بیورو اور پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ میں ملازمت کرتے رہے۔ بیورو کی ملازمت ختم ہونے کے بعد جالندھر کی ایک فرم مالک رام بند رابن میں سو روپیہ ماہانہ پر ملازمت کر لی۔ لیکن یہاں ان کا دل زیادہ دنوں تک نہیں لگا اور انھوں نے نوکری سے استعفیٰ دے دیا۔ پھر اس کے بعد ایک اگست ۱۹۳۹ء کو ٹریڈ کمیشن آفس (Trade Commissioner Office) اسکندریہ (مصر) میں پرنسپل (Superintendent) کا چارج لیا۔ اس میں ان کا تقریر تین سال کے لئے کیا گیا تھا لیکن دوسری عالمی جنگ کی وجہ سے ان کی تقرری میں اضافہ ہوتا ہوا اور اس طرح یہ ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء تک اپنے عہدے پر فائز رہے۔ ملک آزاد ہونے کے بعد حکومت ہند نے ایٹن فارن سروس (I. F. S.) کی تشکیل کی اور مصر کے قاہرہ میں ہندوستانی سفارت خانہ کھولا گیا اس سفارت خانہ کے شعبہ تجارت میں بحیثیت پرنسپل مالک رام نے ۱۹۴۹ء تک اپنے خدمات کو بخوبی انجام دیا۔ مالک رام کے اس کام سے سفارت خانے کے افسران بہت خوش و مطمئن تھے۔ اس لئے انہوں نے مالک رام کو پرنسپل کے عہدے سے ترقی دے کر کمرلیری شعبہ تجارت مقرر کر کے ۱۹۵۰ء میں ہندوستانی سفارت خانہ بغداد (عراق) بھیج دیا۔ جہاں انہوں نے ۱۹۵۱ء تک اپنے خدمات انجام دیئے۔

’’مالک رام نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز رابندر ناتھ ٹیگور کی شاہکار تصنیف ’’گیتا نجی‘‘ کے ایک ٹکڑے کا سلیس اردو نثر میں ترجمہ کر کے کیا۔ جو ۱۹۲۴ء میں ’’نیرنگ خیال‘‘ لاہور کے کسی شمارے میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ایک چھوٹا سا تقابلی مضمون ’’ذوق و غالب‘‘ کے عنوان سے لکھا جو ستمبر ۱۹۲۶ء میں ’’نگار‘‘ کے شمارے میں شائع ہوا۔ پھر عبدالرحمن بجنوری کے انگریزی مضمون ’’اسرار خودی‘‘ و ’’رموزے بے خودی‘‘ کا ترجمہ مع حواشی کے ’’مثنویات اقبال‘‘ کے عنوان سے کیا جو ۱۹۳۲ء میں ’’نیرنگ خیال‘‘ کے اقبال نمبر میں شائع ہوا۔ غالب کا فارسی شعری مجموعہ ’’سبد جبین‘‘ کو نئے سرے سے ترتیب دیا جو ۱۹۳۸ء میں مکتبہ جامعہ دہلی سے شائع ہوا۔ غالب کی سوانح عمری پر ایک کتاب ’’ذکر غالب‘‘ کے عنوان سے لکھی یہ کتاب بھی مکتبہ جامعہ دہلی سے شائع ہوئی۔‘‘

۱۹۵۲ء کے اوائل میں وہ بغداد سے دہلی آئے اور یہاں سمرنا (ازمیر) کے آفس میں دو برس تک کام کیا۔ اس کے بعد ۱۹۵۳ء کے آخر میں ان کو قائم مقام ٹریڈ کمشنر بنا کر دوبارہ اسکندریہ (مصر) بھیجا گیا۔ پھر اکتوبر ۱۹۵۴ء میں ان کا تبادلہ وزارت خارجہ دہلی میں کر دیا گیا جہاں یہ کنزرویٹو آف امپورٹس کی حیثیت سے ۱۹۵۵ء سے لے کر ۱۹۵۸ء تک رہے۔ حکومت ہند نے قاہرہ میں ایک ٹریڈ سنٹر کھولا تھا جہاں ہندوستانی مصنوعات کی نمائش لگائی جاتی تھی۔ اس ٹریڈ سنٹر میں مالک رام کو حکومت ہند نے ڈپٹی ڈائریکٹر بنا کر بھیجا جہاں پر یہ ۱۹۶۰ء تک اپنے فرائض کو انجام دیتے رہے۔ پھر حکومت ہند نے ان کا تبادلہ بحیثیت سکرٹری تجارت سفارت خانہ بلجیم میں کر دیا۔ یہاں پر انھوں نے مارچ ۱۹۶۲ء تک اپنی خدمات کو انجام دیا پھر اپریل ۱۹۶۳ء میں ٹرانسفر ہو کر وزارت خارجہ حکومت ہند دہلی آگئے اور اسی وزارت میں کام کرتے ہوئے مارچ ۱۹۶۵ء میں باعزت رٹائر ہوئے۔ ڈاکٹر ڈاکر سین جو اس وقت سائبیہ اکادمی دہلی میں صدر تھے جب ان کو پتہ چلا کہ مالک رام سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں تو انھوں نے مالک رام کو اسی دن ایڈیٹر اردو شیکشن (سائبیہ اکادمی دہلی) مقرر کر لیا جہاں پر انھوں نے مالک رام کو مولانا ابوالکلام آزاد کی تصانیف کی ترتیب و تدوین کا کام ان کے سپرد کیا جس کو مالک رام نہایت عقلمندی سے کرتے رہے اور پھر ۳ سال بعد ۱۹۶۸ء میں استعفیٰ دے کر دہلی کی ایک مشہور لمیٹڈ پبلیشنگ ”بائنڈر موڈرن پبلیشنگ“ میں ”میڈیکل ڈائریکٹر“ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ اس کمپنی میں میڈیکل ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کرتے ہوئے اردو تحقیق کو فروغ دینے والا سہ ماہی رسالہ ”تحریر“ کے اعزازی مدیر کی ذمہ داری بھی قبول کر لی۔ اور جب ۱۹۷۸ء میں رسالہ نکلنا بند ہوا تو اپنی ذمہ داری سے بھی سبکدوش ہو گئے۔ مالک رام پوری زندگی ملازمت اور تصنیف و تالیف کا کام کرتے رہے۔ پیری نے کب دتک دے دی ان کو پتہ ہی نہ چلا۔ کافی دیر تک مسلسل کام کرنے کی وجہ سے ان کے پیروں میں ورم آجاتا تھا اور دل کا عارضہ تو ان کو پہلے ہی لگ چکا تھا۔ کئی بار دورے بھی پڑے لیکن علاج سے ٹھیک ہو جاتے تھے۔ مارچ ۱۹۹۳ء کے آخری ہفتے میں ان کو زلہ، بخار اور سانس لینے میں تکلیف ہونے لگی۔ جب سانس میں گھٹن اور بڑھتی گئی تو ان کو ”مول چند اسپتال“ میں بھرتی کرایا گیا۔ جہاں ڈاکٹروں نے بہتر سے بہتر علاج کیا۔ لیکن ان کی حالت اور خراب ہوتی گئی۔ آخر کار ۱۷ اپریل ۱۹۹۳ء کو ”مول چند اسپتال“ نئی دہلی میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے جسد خاکی کو لودھی روڈ شمشان گھاٹ میں نذر آتش کر دیا گیا۔

مالک رام نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز رابندر ناتھ ٹیگور کی شاہکار تصنیف ”گیتا گوبی“ کے ایک ٹکڑے کا سلیس اردو نثر میں ترجمہ کر کے کیا۔ جو ۱۹۲۴ء میں ”نیرنگ خیال“ لاہور کے کسی شمارے میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ایک چھوٹا سا نقابلی مضمون ”ذوق وغالب“ کے عنوان سے لکھا جو ستمبر ۱۹۲۶ء میں ”نگار“ کے شمارے میں شائع ہوا۔ پھر عبدالرحمن بجنوری کے انگریزی مضمون ”اسرار خودی“ و ”رموزے بے خودی“ کا ترجمہ مع حواشی کے ”مثنویات اقبال“ کے عنوان سے کیا جو ۱۹۳۲ء میں ”نیرنگ خیال“ کے اقبال نمبر میں شائع ہوا۔ غالب کا فارسی شعری مجموعہ ”سہجین“ کو نئے سرے سے ترتیب دیا جو ۱۹۳۸ء میں مکتبہ جامعہ دہلی سے شائع ہوا۔ غالب کی سوانح عمری پر ایک کتاب ”ذکر غالب“ کے عنوان سے لکھی یہ کتاب بھی مکتبہ جامعہ دہلی سے شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ مالک رام نے ”تذکرہ معاصرین“ (چار جلد)؛ ”تلاذہ غالب“؛ ”ایرانی شہنشاہی کے ڈھائی ہزار سال“؛ ”فسانہ غالب“؛ ”گفتار غالب“؛ ”تذکرہ ماہ و سال“؛ ”عورت اور اسلامی تعلیمی“؛ ”قدیم دلی کالج“ وغیرہ پیش تر تئیں تخلیق کیں۔ مالک رام اردو کے مشہور محقق و ماہر غالبیات اور بے شمار کتابوں کے تحقیق کار ہی نہیں بلکہ ایک نامور خاکہ نگار بھی ہیں۔ ان کے خاکوں کا مجموعہ ”وہ صورتیں

الہی“ ۱۹۷۴ء میں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی سے شائع ہوا۔ جو دس خاکوں پر مشتمل ہے۔ اس میں شامل خاکے مندرجہ ذیل ہیں۔ غالب، سائل، دہلی، صدر یار جنگ، (مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی) سید سلیمان ندوی، برج موہن دتاتریہ کیفی، یاس یگانہ چنگیزی، جگر مراد آبادی، نیاز اور نیاز مند، نیاز فتح پوری، غلام رسول مہر وغیرہ۔ اس مجموعے کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مالک رام نے خاکہ نگاری کے فنی تقاضوں کو مد نظر رکھ کر ایک بہترین خاکہ لکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس مجموعے میں شامل پہلا خاکہ ”مرزا غالب“ مالک رام کے خیال تحقیق اور تخلیق کا بہترین نمونہ ہے۔ جب کہ یہ خاکہ غالب کی وفات کے تقریباً سو سال بعد لکھا گیا ہے۔ اس خاکے میں مالک رام اپنے خیال اور صیغہ واحد متکلم کی تکنیک استعمال کر کے غالب کے ہمعصر بن گئے ہیں۔ اور اپنے خیال کے سہارے غالب سے چند ملاقاتیں کر کے ان کے ابتدائی زمانے سے لے کر ان کی وفات تک کے تمام حالات و واقعات کو بڑے دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ اس طرح غالب کے عادات و اطوار، نشست و برخاست کے انداز، روزمرہ کے معمولات، ان کی خانگی زندگی اور دربار سے ربط و ضبط، دوست احباب کی صحبت، ان کی پسند اور ناپسند اشیاء، ان کی صورت و سیرت، اعزہ و اقارب سے تعلقات، ان کے جسم کو گھلا دینے والی بیماریوں کی وضاحت، غرض ہر اس پہلو پر روشنی ڈالی ہے جس سے غالب کی وہ بوجہ جیتی جاگتی تصویر قاری کے نظروں کے سامنے ابھر سکے۔ اسی طرح غالب کی شکل و صورت اور علمی کی تصویر کتنے دلچسپ انداز میں کھینچی ہے ملاحظہ کیجئے:

”میرزا صاحب کا سن پچاس سے اوپر تھا۔ چوڑا چکلا باڑ، داڑھی صفا چٹ، نازک باریک مونچھیں، نخیل تاؤ دے رکھا تھا، بڑی بڑی غلانی آنکھیں، سرخ و سپید رنگ، جس میں چمپنی دمک تھی، سر پر لمبے لمبے بیٹھے، قلموں پر لکھتے ہوئے بال، سر پر ایک پلے کی ہلکی سی ٹوپی جس پر کشیدہ کا کام تھا۔ بدن پر تریب کا انگرکھا، اور نیچے ایک برکاسپید پاجامہ۔ پاؤں میں صہیلی جوتی۔ ہاتھ میں پیچوان کی شک تھی اور کش لگا رہے تھے۔“

مالک رام کو قلمی چہرہ اور علیہ پیش کرنے میں بڑی مہارت حاصل ہے۔ اتنے تفصیل سے بیان کرتے ہیں کہ صاحب خاکہ سے بالکل، اجنبیت کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس شخصیت سے بڑی پرانی جان پہچان ہوگوییاس سے مل چکے ہوں۔ ان کی یہ خوبی اور نکال ان تمام ادبی شخصیتوں میں دیکھنے کو مل جاتی ہے جن کا خاکہ انھوں نے خود رقم کیا۔ اپنے خاکے ”سائل دہلی“ میں نواب سراج الدین احمد خاں کی ایسی جاذب تصویر کھینچی ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تصویر کسی کیمرے سے لی گئی ہو۔ اقبال س ملاحظہ کیجئے:

”زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایک نورانی صورت بزرگ داخل ہوئے۔ تقریباً ستر برس کا سن، کوئی پونے چھ فٹ کا قد، کمر میں خفیت سا خم۔ میدہ و شہاب کی ملی جلی رنگت، ملبوڑا استبابی چہرہ، کشادہ پیشانی، اونچی کانٹھی کی لمبی عتاقی قسم کی نوکدار ناک، گلے کی ہڈیاں نمایاں طور پر ابھری ہوئی۔ مڈول جسم، سنہری جھلک مارتی ہوئی سپید ڈاڑھی، جو ایک مشت تو یقیناً تھی، دو انگشت کی خدا جانے شرعی لمبیں، آنکھیں نسبتاً چھوٹی لمبے لمبے بازو اور ہاتھ پاؤں۔ سر پر ہلکی سی پلے کی ٹوپی، جس کے نیچے سے لمبے لمبے ہچڑی بال نکلے پڑتے تھے۔ گلے میں کاج پٹی گر بیان اور ٹھلی استتبیوں کا مکمل کا کرتہ، کندھے پر رومال، نیچے لٹھے کا آٹا پاجامہ۔ پاؤں میں خوردنوک کا جوتا۔ دائیں ہاتھ میں لکڑی اور بائیں میں مگر بیٹ کا بکس اور دیاسلانی کی ڈبیا۔“

مالک رام صرف صورت و حلیہ بیان کرنے میں ہی قدرت نہیں رکھتے۔ بلکہ جس شخصیت پر قلم اٹھاتے ہیں اس کے سلسلے میں کوئی بات ادھوری نہیں چھوڑتے اتنے تفصیل سے ہر بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ کہیں بھی قاری کی طبیعت پر گراں نہیں گزرتا۔ اگر شخصیت ادیب یا فن کار ہے تو اس کا پورا شجرہ کھنگال لیتے ہیں اور اس کے پورے خاندان کی نشاندہی کر دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں خاکہ ”سائل دہلوی“ کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے جس میں نواب سراج الدین احمد خان کے پورے خاندان کا شجرہ بیان کیا ہے:

”یہ تھے نواب سراج الدین احمد خان سائل دہلوی بن نواب شہاب الدین احمد خان ثاقب بن نواب ضیاء الدین خان بہادر نیر خٹاں بن فخر الدولہ نواب احمد بخش خان بہادر (والی فیروز پور جھڑکہ ولہار) بن مرزا عارف جان بنارائی“۔

مالک رام شجرہ نگاری کے ساتھ ساتھ جزئیات نگاری پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ ہر موقع و واقع کا بیان بڑی تفصیل سے کرتے ہیں۔ کوئی بھی جزاں کی نظر سے بچ نہیں سکتا۔ اپنے تخیلی خاکے ”میرزا غالب“ میں غالب کے ناشتے اور کھانے کا بیان اتنے دلکش انداز میں کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ غالب ناشتہ کر رہے ہیں۔ کھانا کھا رہے ہیں اور ہم انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ جبکہ مالک رام نے غالب پر یہ خاکہ غالب کی وفات کے سو سال بعد لکھا۔ لیکن انداز بیان کی انوکھی تکنیک کا استعمال کر کے وہ غالب کے ہم عصر بن گئے ہیں اور قاری کو کسی بھی موقع پر یہ محسوس نہیں ہونے دیتے کہ وہ غالب کے ہم عصر نہیں رہے ہیں۔ غالب کے ناشتے اور کھانے کا منظر ملاحظہ کیجئے:

”تھوڑی دیر میں وفادار ملازمہ اندر سے سر پوش ڈھک ہوا ایک لونوار اور دوغالی گلاس لائی، اور انھیں قالین کے پاس رکھ کے چلی گئی۔ میرزا صاحب نے مجھ سے پوچھا: کیوں بھائی، حصہ کرو گے۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور پوچھا کہ کیا ہے کہنے لگے: بادام اور مصری، کوئی حرام چیز نہیں۔ بات یہ ہے کہ ایک زمانہ سے مجھے گرمی کی شکایت ہے۔ حکیم صاحب نے کہہ رکھا ہے کہ رات کو پندرہ ایک بادام پانی میں بھگو دو۔ صبح جھلکا اتار کر انھیں خوب گھونٹ لو اور اس شیرہ میں گلاس بھر مصری کا شربت ملا کر پی جاؤ۔ چنانچہ گرمی ہو کہ جاڑا۔ روزانہ صبح نہار منہ، یہ ٹھنڈا پانی پیتا ہوں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس سے دن بھر طبیعت میں تازگی اور فرحت محسوس کرتا ہوں۔ اس تبرید کے لئے مصری خاص طور پر پیکانیر سے منگواتا ہوں کہ وہاں کی مصری صاف اور خشک اور مٹھاس میں خوب ہوتی ہے۔ یہاں جو مصری بازار میں ملتی ہے اس میں نمی ہوتی ہے۔ باتیں ہو رہی ہیں کہ اندر سے نیاز علی نے آکر اطلاع دی کہ کھانا تیار ہے، حکم ہو تو نکلوا یا جائے۔ اس پردہ و متنوں نے اجازت چاہی اور میرزا صاحب اور میں دونوں بچوں کے ساتھ اندر گئے۔ اندر ایک دالان میں فرش پر دسترخوان بچھا تھا۔ کھانے میں جینا ہوا گوشت تھا۔ قیمہ بھرے کریلے تھے۔ بریانی پلاؤ تھا اور ایک ترکاری تھی۔ روئے کا علوہ تھا۔ دو تین قسم کا سر کے اور تیل کا چار تھا۔ لیکن ایک بات عجیب دیکھی کہ قیمے اور گوشت ترکاری میں سب میں چنے کی دال پڑی ہے، دالے میں کم اور گوشت ترکاری میں زیادہ میرزا صاحب نے ترکاری کو تو ہاتھ بھی نہیں لگایا، دو ایک نوالے

کریلے کے ساتھ کھائے، تھوڑے سے چاول بھی کھکھے۔ البتہ گوشت بہت رغبت سے کھایا اور کافی مقدار میں کھایا۔“

حقیقت یہ ہے کہ غالب پر مالک رام کا لکھا ہوا خاکہ اتنا دلچسپ اور اسلوب اتنا اٹھانے کے اردو میں اس کی کوئی مثال نہیں اس سلسلے میں ڈاکٹر صابرہ سعید رقم طراز ہیں کہ:

”غالب پر ان کا خاکہ محض تخیل اور مکاشفہ کا کرشمہ نہیں ہے۔ انھوں نے غالب کی اور غالب پر لکھی ہوئی تمام تحریروں کا مطالعہ کیا۔ لوہار و خاندان کے بڑے بوڑھوں سے معلومات حاصل کی، اپنی تہذیبی بصیرت اور نفسیات انسانی کے مشاہدے کے سہارے غالب کی شخصیت اور زندگی کا خاکہ ایسے کمال کے ساتھ پیش کیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے وہ برسوں غالب کے ساتھ رہ چکے ہیں اور ان کے وظائف شب و روز کا آنکھوں دیکھا حال بیان کیا ہے۔ شخصی خاکہ نگاری میں یہ ایک نیا اور کامیاب تجربہ ہے۔“

مالک رام جزئیات نگاری میں معراج کمال پر تھے۔ شخصیت سے متعلق ہر چیز کا بیان بڑی وضاحت سے کرتے ہیں۔ چاہے وہ روزمرہ کے معمولات ہوں یا رہن سہن کے انداز ہوں ہر چیز کی تصویر بڑی مکمل اور صاف ستھری پیش کرتے ہیں۔ اپنے خاکے ”سائل دہلوی“ میں سائل صاحب کے گھر کے اندر کا نقشہ ایسا کھینچا ہے کہ ان کی پوری شخصیت جلوہ گر ہو اٹھتی ہے۔ اس سلسلے میں یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

”میں ملازم کے پیچھے بیڑھیاں چڑھ کے ڈیوڑھی میں آیا۔ یہاں اندر گھستے ہی دائیں طرف ایک چھوٹی سی کوٹھری یقیناً ملازم کے لئے تھی۔ اسی طرف کے کونے میں اوپر پر جانے کا زینہ تھا۔ سامنے کے رخ پر ایک دروازہ تھا، جس پر پردہ پڑا تھا۔ یہ گھر کے صحن میں کھلتا تھا۔ پیش طاق پر ایک تختی لگی تھی، جس پر لکھا تھا: مکان لاڈلی بیگم۔ اسے دیکھ کر مجھے معاً ”حویلی علی نقی خاں بہادر کی“ والا لطیفہ یاد آ گیا۔ اٹے ہاتھ کی بغل میں بیٹھنے کا کمرہ تھا۔ جس میں داخل ہونے کے لئے دو بیڑھیاں چڑھنا پڑتی تھیں۔ ملازم نے کمرے کا دروازہ کھولا اور مجھے یہاں بٹھائے کہ خود نواب صاحب کی خدمت میں اطلاع دینے چلا گیا۔ میں نے اپنے ارد گرد نگاہ ڈالی، تو دیکھا کہ وہاں اچھا خاصا مشرقی اور مغربی تمدن کا امتزاج ہو رہا ہے۔ یعنی کمرے میں دری کا فرش تھا، اس کے اوپر نصف کمرے کے لگ بھگ سفید براق چاندنی بچھی تھی۔ صدر میں ایک چھوٹا سا ایرانی قالین اور دو بڑے بڑے گاؤ تکتے لگے رکھے تھے۔ نشت کے قریب چاندی کا پاندان، چچوان اور لگن، دو تین اگالدان اور سکرٹ کی راکھ بھاڑنے کی پیالیاں دھری تھیں۔ اور جہاں چاندنی نہیں تھی، وہاں چند کرسیاں اور ایک چھوٹی سی تپائی کچی تھی۔“

مالک رام کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ وہ جس شخصیت کی مرقع کشی کرتے ہیں وہ اپنے عہد و ماحول کے ساتھ جاگ اٹھتی ہے۔ اور قاری تھوڑی دیر کے لئے اپنے ارد گرد کے ماحول و حالات سے بے خبر ہو کر ماضی کی دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ جہاں اسے آزادی کے پہلے کا ہندوستان اور اس عہد کی سیاسی و سماجی سرگرمیاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ماضی کی باز آفرینی کا اصل کمال ان کے خاکے ”میرزا غالب“ میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ جہاں یہ قاری کو غالب کے عہد کی دلی، اس

غزل

ایک ایسی کتاب لکھوں گا
خاموشی بے حساب لکھوں گا

زندگی سے ملے ہیں جتنے غم
سارے غم کا حساب لکھوں گا

میں ستایا ہوا زمانے کا
ساری دنیا خراب لکھوں گا

وہ ملا اور میں تباہ ہوا
اس کا ملنا عذاب لکھوں گا

اس کی تصویر سامنے رکھ کر
اس کا حسن و شباب لکھوں گا

ایسی قاتل تباہ گن آنکھیں
اس کی آنکھیں شراب لکھوں گا

عمر بھر جس کی پردہ پوشی کی
اب اسے بے نقاب لکھوں گا

بے بسی بے حساب آمل کی
ابھی کچھ اور باب لکھوں گا

آمل الہ آبادی

الہ آباد، یوپی

8208589570

زمانے کے سیر تماشا، لال قلعہ، جامع مسجد، پتنگ بازی کے میلے، جمننا کا کنارہ، بلی ماروں کا محلہ، کالے صاحب کی حویلی اور محل سرائی سیر کراتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

”میرزا صاحب نے جامع مسجد کی سیڑھیوں سے پالکی واپس کر دی اور ہم پیدل سیر کرنے لگے۔ ایک ہنگامہ تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ کہیں بازو بگڑ اپنے کرتب دکھا رہا ہے، یا لوگ اس کے گرد پراپاندھے کھڑے ہیں۔ کہیں بھان متی کا تماشا ہو رہا ہے، اور یہاں بھی ٹھٹ لگے ہوئے ہیں۔ دوسری طرف، خواجہ والے طرح طرح کی بولیاں بول رہے ہیں۔ سیڑھیوں پر ہر طرح کی دکانیں سج رہی ہیں۔ پتلے پتلے مرزا صاحب ایک جگہ رک گئے، اور کلیان سے کہا، جاؤ کلن کی دکان سے رات کے لئے چار آنے کے بیج کے کباب لے آؤ۔ وہ دونے میں کباب رکھوا لایا۔ میں نے راستے میں ایک جگہ سے دو تین مٹائیں خریدیں اور میرزا صاحب نے بچوں کے لئے کچھ کھلونے اور مٹھائی خریدی۔ واپسی میں چاندنی چوک کے راستے سے ٹہلتے ہوئے آئے۔ سعادت خان کی نہر سڑک کے پتھوں بیچ تھی۔ دو رویدہ درختوں کی قطار اور دکانوں کی روشنی کا پانی میں عکس، عجیب پر لطف نظارہ تھا۔ دن بھر کی گرمی سے طبیعت جتنی گھبرائی ہوئی تھی، اتنی ہی اس وقت شام کی سہانی فضا میں محفوظ ہوئی۔ سینکڑوں آدمی نہر کے کنارے بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔“

مالک رام نے اپنے تمام خاؤں میں ہر جگہ غیر جانبداری سے کام لیا ہے۔ جو شخصیت جس چیز کی حامل تھی اسے ہو ہو ویسا ہی پیش کیا ہے۔ نہ بے وجہ کسی کی مدح سرائی کی اور نہ جو مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کی شخصیت خوبیوں کی حامل تھی تو ان کی خوبیوں کو ظاہر کیا اس کے برعکس سید سلیمان ندوی کی شخصی غامی پر نہیں بھی پردہ نہیں ڈالا بلکہ غیر جانبدارانہ طور پر اس کو پیش کیا لیکن اس بات کا خیال رکھا کہ ان کی عظمت پر نہیں بھی حرف نہ آنے پائے۔

مالک رام کے خاؤں کا جائزہ لینے کے بعد یہ بات صاف طور سے واضح ہے کہ ایک خاکہ نگار کے اندر جو فنی خوبیاں ہونی چاہئے وہ سب مالک رام کے پاس ہیں ان کی تحریر بڑی سادہ و سلیس اور رواں ہے کہیں بھی مرصع کاری کا عکس نظر نہیں آتا۔ ہر سطر میں معنویت اور دلچسپی نظر آتی ہے۔ زبان کا استعمال ٹھیک اور معتدل انداز میں کیا ہے۔ اسلوب ان کا جدا گانہ ہے۔ واقعات اور تاثرات کا خاص توازن ان کے اندر پایا جاتا ہے۔ آخر میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ خاکہ نگاری کے فنی تقاضوں کو زیر نظر رکھ مالک رام نے جتنے بھی خاکے لکھے وہ سب صنف خاکہ نگاری میں ایک پیش قیمتی اضافہ ہیں۔ اور اردو خاکہ نگاری کی تاریخ میں مالک رام کو بحیثیت خاکہ نگار زندہ رکھنے کے لئے کافی ہیں۔

حواشی:

۱۔ مالک رام، ”وہ صورتیں الہی“، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۱۹۷۶ء، ص ۱۵، ۱۴

۲۔ ایضاً ص ۵۲

۳۔ ایضاً ص ۵۲

۴۔ ایضاً ص ۱۸، ۱۹، ۲۰

۵۔ ڈاکٹر صابرہ سعید، اردو ادب میں نئی خاکہ نگاری، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۲۰۱۷ء، ص ۱۶۲

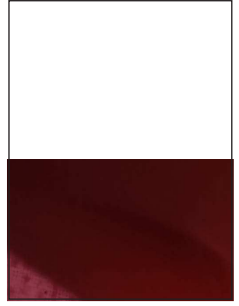
۶۔ مالک رام، ”وہ صورتیں الہی“، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۱۹۷۶ء، ص ۵۱

۷۔ ایضاً ص ۲۷

□□□

ڈاکٹر مناسیم
اسٹنٹ

8820414403



سالک لکھنوی شخصیت کے آئینے میں تحریر

سالک لکھنوی کثیرالوجہات شخصیت اور غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک ہونے کے ساتھ ساتھ ہر دم فعال رہنے والے انسان تھے۔ وہ نہ صرف ایک بلند پایہ شاعر، نقاد، افسانہ نگار، ایک کامیاب شارح، مبصر، مترجم، سماجی کارکن اور بہترین صحافی تھے۔ شرافت اور مروت انکی ذات گرامی کی خاص خوبیاں ہیں جو نبی نسل کے لئے مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ عمر کے ابتدائی ایام میں تمام آفتابوں سے محروم رہنے والے انسان کی حیثیت سے سالک صاحب نے کبھی اپنے عزم پر حالات کو حاوی ہونے نہیں دیا۔ سالک لکھنوی کی تصویر اگر کوئی شخص اپنے تجل کی مدد سے بنانا چاہے تو اس کے ذہن میں روایتی شاعروں کا خاکہ آئے گا۔ مثلاً شیر وانی میں ملبوس، سر پر اونچی ٹوپی، دراز گیسو وغیرہ۔ لیکن ایسا بالکل نہیں ہے۔ ان کے ہم عصروں سے پتہ چلا جنہوں نے جب انہیں دیکھا تو انکی واضح قطع کچھ اس طرح سے تھی گوری رنگت چمکدار آنکھیں ان پر عینک، کشادہ پیشانی جس پر گت و شنید کے وقت کی بل پڑتے تھے۔ میانہ قد، ہلکی موچہ متناسب ہونٹ دھیمالہجہ قید و بند اٹھانے والے ایک سیاستدان اور اپنی ذات میں خود ایک جیتی جاگتی انجمن بھی رہ چکے تھے۔ انکی شخصیت بڑی پہلو دار اور پرکشش نظر آتی ہے۔ سالک صاحب کی سماجی و ادبی خدمات کی وجہ سے انکی شخصیت ہیرے کی مانند آج بھی چمکتی ہے۔ سالک صاحب یتیم خانہ اسلامیہ کلکتہ کے قدیم ممبر تھے۔ اسی زمانے میں انکی بیکریٹری شب میں سی۔ ایم او۔ ہائی اسکول کا قیام عمل میں آیا۔ اس سلسلے میں خاص بات یہ ہے کہ اسکول کے ابتدائی دو مہینوں میں اساتذہ اور دیگر اساتذ کی تحویلیں انہوں نے اپنی جیب خاص سے دیں۔ بہتوں کو اردو آرز ایم۔ اے اور پی ایچ ڈی کی تیاری میں انہوں نے گائیڈ کیا۔ ہمیشہ حاجت مندوں کی ضروریات کا خیال رکھا۔ انکی فیاضی کا یہ عالم ہے کہ انہوں نے ڈیڑھ لاکھ روپے کی محتاجی مع الماری مغربی بنگال اردو اکاڈمی کو عنایت کر دیں۔ ایک صحافی کی حیثیت سے اگر سالک صاحب پر نظر ڈالیں تو پائیں گے کہ انہوں نے نہ صرف معیاری اور مثبت صحافت کا نمونہ پیش کیا۔ بلکہ ادب اور صحافت کو قریب تر لانے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے افسانے مضامین ترجمے طنز و مزاح گو بیشتر اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور عمدہ تصانیف یادگار چھوڑی ہیں۔ عہد اور دیگر افسانے (1941ء) پس شعر (1981ء) بے سرو پا (طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ 1982ء) بنگال میں اردو نثر کی تاریخ آفاذ تا حال (1998ء) ترجمہ کامرہ مظفر احمد حیات و خدمات (1983ء) سالک لکھنوی کی ادبی و سماجی خدمات کی وجہ سے انہیں بہت سارے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ایوارڈ: 1) جوش ملیح آبادی مغربی بنگال اردو اکاڈمی (1984ء) 2) فریڈم فائیر ایوارڈ کلکتہ یونیورسٹی (3) پیش فورم سند اعزاز کلکتہ (1985ء) 4) پدم شری ایوارڈ (2013ء) بعد مرگ (5) کل ہند پرویز شادی ایوارڈ مغربی بنگال اردو اکاڈمی (2002ء) اس میں کوئی شک نہیں کہ سالک صاحب اخلاص و محبت کا بیکر تھے۔ انکے لہجے میں لکھنوی جھلک ملتی ہے۔ وہ اپنے احباب کا بڑا حلقہ رکھتے تھے۔ اپنے حلقے میں مہمان نوازی کے لئے بھی مشہور تھے۔ باہر سے آنے والے اکثر و بیشتر شعراء حضرات انکی مہمان نوازی سے لطف اٹھا چکے ہیں۔ جو شخص ان کے یہاں ایک دفعہ طعام و قیام کر لے وہ دوسری دفعہ آنے کی خواہش ضرور ظاہر کرتا تھا۔ اسکی وجہ صرف سالک صاحب کا بلند پایہ اخلاق تھا کوئی بھی انکی دعوت قبول کرنے سے انکار نہیں کرتا شعر و ادب کی بے شمار تحفیں پاؤں میں پڑی سیاہ زنجیر یا سر پر لہرائی ناڈ کی تلوار بھی خوفزدہ کم ہی کرتی ہے۔ برطانوی دور حکومت میں بھی یہی بے باکانہ بلکہ اس سے زیادہ مجرمانہ انداز جینے کا تھا۔ 18 ماہ کی سزا بھی ہوتی تھی۔ مگر قیدی کی شرافت و جاہت دیکھ کر انگریز بہادر نے بعد میں سزائی میعار کم کر دی تھی۔ لکھنوکو سالک صاحب نے غیر باد بکھا تھا تو صرف زبان ساتھ تھی وہاں کی تہذیب وضع داری رواداری شرافت اور نفاست وغیرہ کو بھی جسم و جان کی طرح ساتھ رکھا تھا۔ آسمان نے پلٹے کھائے زمینیں بٹ گئیں دلوں کے کجڑے ہو گئے۔ آئین آباد کے آداب و رسوم کوئی کی لہروں کے ساتھ بہہ گئے مگر سالک صاحب کلکتہ جیسے صنعتی و آہنگی شہر میں بھی لکھنوی تہذیب کو امانت سمجھ کر سینے سے لگا رکھا۔

”سالک لکھنوی کو حادثوں سے کھیلنے کی ایسی عادات تھی ان کا انداز بیان کافی دلکش اور دلنشین تھا دوران گفتگو ان کے لبوں پر ہلکا سا تبسم سجا رہتا جس سے سامنے والا شخص متاثر ہو جاتا تھا۔ دوران گفتگو آنکھیں کبھی پھیل جاتیں اور موضوع کو بااثر بنانے کے لئے چہرے پر اس طرح لاتے جیسے الفاظ کے ساتھ روح روشن بھی نک و دود کر رہا ہو۔ لہجے میں زور ہوتا لیکن غصے کا شائبہ تک نہیں رہتا۔ سالک لکھنوی کے اس دلنشین انداز گفتگو کی ایک بڑی وجہ لکھنوی نفاست شائستگی نرم مزاجی اور شریں کلامی تھی۔ سالک لکھنوی ایک بھولے بھالے شریف آدمی تھے۔ جس کو انسان ہونا میسر تھا۔ مسلمانوں سے ہمدردی بہت تھی۔ مگر ہندوؤں سے نفرت ذرا بھی نہیں کرتے تھے۔ انسان میں تفریق کرنے والے نظریات سے انہیں نفرت تھی۔ ہر انسان کو بلا تفریق مذہب و ملت انسان سمجھا اور پیار بھری نظروں سے دیکھا۔ انکی نظر میں کسی شخص کا کسی مذہب سے وابستہ ہونا ایک الگ بات تھی۔ وہ انسانیت کی نظر سے دیکھتے تھے۔“

غزل

یہ ہے ایسا سنگر جس کی من مانی نہیں جاتی
کروں کیا میں دل ناداں کی نادانی نہیں جاتی

تری بزم طرب میں چار سو خوشیوں کا موسم ہے
مگر کیا بات ہے کیوں دل کی ویرانی نہیں جاتی

تعجب ہے شب ہجراں اسے جتنا تراشوں میں
نہیں جاتی تری زلفوں کی طولانی نہیں جاتی

فلک کے چاند تاروں کو مسخر کر لیا ہم نے
مگر اس دہر سے انساں کی ارزانی نہیں جاتی

کئی ہے عمر یوں تو خود فراموشی کے عالم میں
ستم گر کیوں تری یادوں کی طغیانی نہیں جاتی

تن نازک ہے شرمندہ یہ کیسی بے حجابی ہے
تو ہے ملبوس لیکن تیری عریانی نہیں جاتی

ہوئی مدت وہ شامًا بھول بیٹھا ہے مجھے یکسر
مری آنکھوں سے اب بھی اشک افشانی نہیں جاتی

ڈاکٹر جوہی بیگم شاما

پریاگ راج، یوپی

7985982665

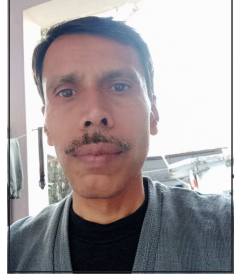
پرائیویٹ لائف کا سلسلہ تو خیر پرائیویٹ لوگوں سے ملتا ہے ان کے گھر پر منعقد ہونے لگے۔ برسوں بزم احباب کا دفتر وہیں رہا اور بزم کے بہت سارے حلقے وہاں ہوئے۔ باہر سے آنے والے اکابر عصر کے لئے انکا گھر ایک قسم کی زیارت گاہ تھا۔ سیاسی رہنماؤں میں محمد علی جناح 'پنڈت جواہر لال نہرو' کامریڈ جوتی باسوا، مشیر علم و ادب میں آل احمد سرور، سجاد ظہیر، کیفی اعظمی، غلیق نجم وغیرہ جب بھی کلکتہ آتے مالک صاحب کے مہمان ہوتے اور انکا گھر پر قیام کرتے۔ مالک صاحب کے طریق سلوک سے جو لوگ واقف ہیں انہیں معلوم ہے کہ موصوف دریا سادل رکھتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا۔ جب کوئی دو نمبر سوتکن اسٹریٹ کی چھت کے تلے طرہ سکتا تھا۔ شرط بس یہی تھی کہ آدمی باذوق ہو۔ مالک صاحب عادات اور فطرتاً ہی آدمی ہیں۔ آپ بڑے دل گردے اور مضبوط اعصاب کے مالک تھے۔ حالات موسم حادثات مخالفین اور بیماریوں سے ساری زندگی ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ بڑھتی ہوئی عمر بھی انکا کچھ نہیں بگاڑ سکی۔ روزمرہ کے غموں کی کھروچ بھی انکے چہرے پر کوئی نشان نہیں چھوڑ سکی۔ ہمیشہ انہوں نے اپنے آپ کو زندگی کے ہنگاموں میں مشغول رکھا۔ مالک لکھنوی کے کم و بیش بہت سارے معاصرین تھے۔ جن میں پرویز شادہ فیض احمد فیض، علی سردار جعفری، فراق گورکھپوری، علقمہ شمس، عصمت چغتائی، مجروح سلطانپوری، کیفی اعظمی، مظفر حنفی انکے علاوہ بھی بہت سارے شعراء و ادباء کے ساتھ انکے تعلقات تھے۔ مالک لکھنوی کو حادثوں سے کھیلنے کی ایسی عادت تھی ان کا انداز بیان کافی دلکش اور دلنشین تھا اور ان گفتگو انکی بولی پر ہلکا سا تہسم سجا رہتا جس سے سامنے والا شخص متاثر ہو جاتا تھا۔ دوران گفتگو انکے کبھی پھیل جاتیں اور موضوع کو بااثر بنانے کے لئے چہرے پر اس طرح لاتے جیسے الفاظ کے ساتھ روح روشن بھی نک و دو در کر رہا ہو۔ لہجے میں زور ہوتا لیکن غصے کا شائبہ تک نہیں رہتا۔ مالک لکھنوی کے اس دلنشین انداز گفتگو کی ایک بڑی وجہ لکھنوی فضا کی شانگنی نرم مزاجی اور شریں کلائی تھی۔ مالک لکھنوی ایک بھولے بھالے شریف آدمی تھے۔ جس کو انسان ہونا میسر تھا۔ مسلمانوں سے ہمدردی بہت تھی۔ مگر ہندوؤں سے نفرت ذرا بھی نہیں کرتے تھے۔ انسان میں تفریق کرنے والے نظریات سے انہیں نفرت تھی۔ ہر انسان کو بلا تفریق مذہب و ملت انسان سمجھا اور پیار بھری نظروں سے دیکھا۔ انکی نظریں کسی شخص کا کسی مذہب سے وابستہ ہونا ایک الگ بات تھی۔ وہ انسانیت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ انہوں نے جہاں ادب میں شاعر ادیب نقاد صحافی کے بطور شناخت بنائی وہی انہوں نے اپنے اعمال و اخلاص کے ذریعے لوگوں کے دلوں پر حکومت کی۔ سادگی انکساری، وضع داری، صبر و تحمل غرض کہ ہر مرحلے کو انہوں نے اس خوبی سے انجام دیا جیسے وہ پوری زندگی اسی کے منتظر و مشتاق رہے ہو۔ غرض یکداخی پوری زندگی ہمارے لئے سبق آموز ہے۔ مالک صاحب نے اپنی زندگی سے ہمیں بتانے کی کوشش کی ہے کہ زندگی جو شخص بن کر نہیں بلکہ شخصیت بن کر جیو کیونکہ شخص تو مر جاتا ہے یہ شخصیت ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔ مگر پبلک لائف میں وہ بڑے مہذب اور وضع دار تھے۔ وضع داری اوپر سے اوڑھ لینے والی کوئی چیز نہیں ہوتی بلکہ پیشانی اٹھا ہوا کرتی ہے۔ وہ ایک پیرچی اس اٹھا کے امانت دار ہوتا ہے یہ اندر کی چیز بنتی اور تب جا کر سالک جیسی مہذب اور وضع دار شخصیت سے اس کا رشتہ استوار ہوتا ہے۔ مالک لکھنوی کو اگر عہد ساز شخصیت کہا جائے تو غلط نہ ہوگا اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی کو ایک مقصد کے تحت گزارا انکی زندگی مسلسل نیک نفسی اخلاص و شرافت و پابندی اصول و ضوابط فروغ قومی یکجہتی ملی و سماجی خدمات احباب نوازی اور ادبی ذوق و شوق کے پیش نظر تصنیف و تالیف اور فکر سخن میں گزری۔ مالک صاحب کو کئی زبانوں کا علم تھا لیکن اس جامعیت اور وسعت نظر کے باوجود بہت ہی سادہ مزاج انسان تھے۔ علمیت کا غرور بالکل نہیں تھا۔ چھوٹے بڑے ہر ایک کی بات کو نہایت ہی توجہ سے سنا اور مشفقانہ انداز میں جواب دینا مالک صاحب کا شیوہ بن چکا تھا۔ مالک صاحب بہت ہی محض نواز تھے۔ صرف شاعروں اور ادیبوں کی یہی عام غریبوں اور ضرورت مندوں کی تن من و جن سے مدد کرتے تھے اگرچہ ثروت میں سیاست اور سماج صحافت اور ادب غرض ہر میدان میں ممتاز شخصیت رکھتے تھے لیکن انتہائی میکسر المزاج تھے۔ ہر شخص سے برابری کی سطح پر ملتے اپنے بزرگوں اور ہم عصروں کا احترام اور چھوٹوں کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھاتے بلکہ مخاطب کی سطح پر اتر کر گفتگو کرتے تھے۔

□□□

ڈاکٹر راشد میاں

شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج، ٹونک

7240302056



منشی بساوان لال شادال اور امیر نامہ

(ریاست ٹونک کے اولین غیر مسلم شاعر اور ادیب)

اردو زبان و ادب کی ترویج و فروغ اور نشر و اشاعت میں ملک ہندوستان کے مختلف علاقوں اور مذاہب کے لوگوں کی شمولیت رہی ہے۔ اردو کے دو مرکزی دبستان دہلی اور لکھنؤ کے علاوہ حیدرآباد، رام پور و بھوپال کے ساتھ ریاست ٹونک کی ادبی خدمات بھی قابل احترام رہی ہیں۔ یہاں کے فرماں رواؤں نے بلا تفریق مذہب و ملت اہل علم حضرات کی سرپرستی و اعانت فرما کر اپنی علم دوستی و ادب نوازی کی جو نظریں پیش کی ہیں اس کی مثالیں ملک میں بہت کم دیکھنے کو ملیں گے۔

اگرچہ ملک میں غیر مسلم وغیرہ اہل زبان بالخصوص ہندو مصنفین نے اردو سے متعلق جو تصنیفی و طباعتی خدمات انجام دی ہیں، ان میں سے بیشتر انتہائی مہتم بالشان ہیں۔ طباعتی خدمات کے اعتبار سے دیکھیں تو منشی نول کشور کی خدمات سنہرے الفاظ میں لکھے جانے کی مستحق ہیں۔ اگر ان کی خدمات نہ ہوتیں تو بلاشبہ ہمارے کئی قدیم مدارس و اسکول اپنی بنیادی کتابوں کی تعلیم و تدریس سے محروم ہوتے۔ ناواقف حضرات کے لئے یہ بات بھی تعجب خیز ہوسکتی ہے کہ فارسی زبان کا پہلا اخبار ایران کے بجائے ہندوستان میں کلکتہ سے راجہ رام موہن رائے نے جاری کیا تھا۔ اردو ادب ابتداء ہی سے غیر مسلم حضرات کا مرہون منت رہا ہے۔ اولاً ڈاکٹر جان گل کرسٹ اور فرٹ ولیم کالج میں ان کے رفقاء کے سبب اردو کو فروغ حاصل ہوا۔ اردو پر خون جگر صرف کرنے والے غیر مسلم ادیب و شاعروں کی ایک طویل فہرست ہے۔ برج نارائن پکست ہوں کہ تن ناٹھ سرشار، ونا تریہ کیشی ہوں خواہ فراق گورکھپوری، پریم چند، مالک رام، حکیم چند، نیرنگیان، چند، کالی داس گپتا رضا اور گوپتی چند نارنگ وغیرہ جیسے محسنین اردو کی ادبی خدمات کے سبب آج اردو ایک بڑے اور بیش قیمتی ذخیرے سے مالا مال ہے۔

ادبی خدمات کے سبب راجستھان کا لکھنؤ کہلانے والی ریاست ٹونک کے غیر مسلم مصنفین کی شعری و ادبی کاوشیں بھی اس ضمن میں قابل ذکر ہیں۔ ریاست میں شعر و ادب کی نشوونما اور ترویج و فروغ کے اعتبار سے جائزہ لینے پر پتہ چلتا ہے کہ بانی ریاست ٹونک نواب امیر الدولہ بہادر کے دربار سے وابستہ نائب منشی بساوان لال شادال ریاست کے اولین غیر مسلم شاعر و ادیب تسلیم کیے جاتے ہیں۔ انہیں فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں تحریر و شاعری کا ملکہ حاصل تھا۔ وہ بیک وقت شاعر، ادیب، مؤرخ، منظر نگار اور لنگا جمنی تہذیب کے علمبردار تھے۔ آپ ہندو تھے مگر مذہبی عقائد کے اعتبار سے آپ خداوند قدوس کے وحدہ لاشریک ہونے پر یقین رکھتے تھے۔ خدا کی حمد و ثنا کے علاوہ شادال کو آنحضرت محمد سے بھی قبی عقیدت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی تصانیف بالخصوص امیر نامہ میں اولاً حمدیہ و نعتیہ اشعار سے شروعات کرتے ہوئے خدا کے فضل سے امیر خاں کے مسند نشین ہونے کا ذکر کیا ہے۔

دراصل بساوان لال شادال کی شہرت کا دار و مدار ان کی ماہر الامتیا و تصنیف امیر نامہ پر ہی منحصر ہے۔ امیر نامہ فارسی زبان میں تحریر کی گئی ریاست ٹونک کی اولین ادبی و تاریخی تصنیف ہے جس کا محور بانی ریاست نواب امیر الدولہ بہادر کی سیرت و سوانح اور جنگی فتوحات و اہم واقعات کو قلمبند کرنا تھا۔ لیکن امیر نامہ محض سیرت و سوانح ہی نہیں شعری و نثری اعتبار سے بھی ایک اہم تصنیف ہے۔ شادال کے ہی عہد کے دربار امیر خاں سے وابستہ شاعر و ادیب فقیر محمد خاں گویا (اجداد جوش ملیح آبادی) نے اپنی تصنیف ’بتان حکمت‘ میں ”امیر نامہ“ کا ذکر اس انداز میں کیا ہے :

”اس کا (امیر خاں کا) بیان اپنی زبان اور زبان قلم سے ادا نہیں ہوسکتا لیکن کچھ تھوڑا سا حال بندے

کا امیر نامہ سے کہ جوتا رہی حالات میں اس امیر کے کسی ہندو نے تالیف کی ہے، دریافت ہوسکتا ہے۔“

(انتخاب بتان حکمت، فقیر محمد خاں گویا مرتب نیر مسعود، یو پی اردو اکادمی، لکھنؤ ۱۹۸۸ء، ص ۱۹)

”امیر نامہ کے اولاً انگریزی زبان میں تراجم ہوئے۔ اس کے بعد اردو اور ہندی زبانوں میں کئی تراجم ہوئے ہیں۔ فارسی میں مولوی نجف علی جھجھری نے سمبت ۱۲۲۸ میں ’لباسی امیر نامہ‘ کے عنوان سے نثر و نظم میں امیر نامہ سے متعلق واقعات بصورت ترجمہ تحریر کیے تھے، جواب گمنام و ناپید ہیں۔ اسی طرح ۱۸۳۱ء میں جنرل میڈکاف کے حکم سے جان بولی صاحب نے کلکتہ میں امیر نامہ کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ یہ ترجمہ بھی اب ناپید و گمنام ہے۔ انگریزی زبان میں ایک اہم ترجمہ ٹی۔ ہنری پرنسپ نے لارڈ ولیم بینکٹ کے حکم سے مئی ۱۸۳۲ء میں کیا تھا، جو اسی سال شائع بھی ہوا۔ اس سے قبل کے مذکورہ دونوں تراجم ناپید و گمنام ہونے کے سبب ٹی ہنری پرنسپ کے ترجمے کو ہی اولیت حاصل ہے۔ امیر نامہ کا ایک منظوم ترجمہ فارسی زبان میں ۱۸۳۵ء میں پائندہ خاں نکہت رامپوری نے کیا تھا۔“

ریاست ٹونک کے عہد امیری کی معروف غیر مسلم شخصیات میں مدارالہمام رائے ہمت رائے، ان کے فرزند رائے داتارام، منشی خاص بھوانی پرساد، وکیل نرگن لال اور توشہ خانہ انچارج منشی دولت رائے بالخصوص اپنی انتظامی صلاحیت و تجربات کے باعث دربار میں نمایاں مقام رکھتے تھے۔ لیکن بساوں لال شاداں وہ واحد شخصیت تھے جنہوں نے نائب میرمنشی کے فرائض و ذمہ داریوں کو بھی نچن و خوبی نہ صرف انجام دیا بلکہ وہ علم و ادب کے میدان میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیتے رہے۔ ان کا سب سے اہم ادبی و تاریخی کام امیرنامہ کی تصنیف ہے جو انہیں آج بھی زندہ رکھے ہوئے ہے۔ بساوں لال شاداں نے امیرنامہ میں امیر خاں کی بہادری، فتوحات اور جنگی کارناموں کو اس طرز میں بیان کیا ہے کہ قاری ان کے انداز بیان کا قائل ہوئے بنا نہیں رہتا۔ امیر خاں کی سیرت و شخصیت پر یہ واحد تصنیف تھی جسے اس عہد میں ایسا قبول عام حاصل ہوا کہ اس کی کاپیاں و نقول متواتر فی الفور تقیم ہوتی رہیں۔ اس کے انگریزی وارد و زبانون میں بھی متعدد تراجم ہو کر منظر عام پر آئے، جس سے اس کی مقبولیت میں مزید اضافہ ہوا۔

شاداں کے سوانحی اشارے :

بساوں لال شاداں نے امیرنامہ میں خود سے متعلق جو سوانحی اشارے مختصراً پیش کیے ہیں وہ اس طرح ہیں۔

”اقترب بساوں لال متخلص شاداں بن تن سکھ رائے، قوم کاہستہ ساکن خطہ پاک بلگرام علاقہ لکھنؤ وارد۔“

(دیباچہ امیرنامہ)

درج بالا نہایت مختصر تحریر سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ منشی بساوں لال شاداں قوم کاہستہ قصبہ بلگرام علاقہ لکھنؤ کے باشندے تھے۔ ان کی اولاً علمی تربیت بھی وہیں ہوئی۔ بلگرام اودھ کا وہ قصبہ تھا جہاں فارسی زبان کی تدریس و تعلیم عام تھی۔ یہاں اس وقت عربی و فارسی زبانون کے کئی عالم موجود تھے۔ شاداں نے بھی ان اساتذہ سے کسب فیض کیا۔

شاداں ریاست ٹونک کے مدارالہمام رائے داتارام کے رشتے میں بھانجے تھے۔ اسی توسط سے وہ ریاست ٹونک کے لشکر میں موہن سنگھ کیمپ میں ملازم ہو گئے۔ ۱۸۱۴ء میں جب میرمنشی بھوانی پرساد نے وطن جانے کے لئے رخصت چاہی تو رائے داتارام نے ان کے عوض شاداں کو نائب منشی کے عہدے پر مقرر کروا دیا۔ اس طرح شاداں کو نواب امیر خاں کے حضور حاضری کا موقع مل گیا۔ شاداں کی صلاحیت بروئے کار آنے پر انہیں نواب صاحب نے امیرنامہ تحریر کرنے کے لئے مقرر کیا۔

نواب امیر خاں کی وفات ۳۰ ستمبر ۱۸۳۴ء کو ہو گئی۔ ان کے فرزند نواب وزیر الدولہ نے مندر نشین ہونے کے بعد شاداں کا منصب بڑھا کر انہیں میرمنشی بنادیا۔ ۱۸۳۶ء میں نواب وزیر الدولہ نے وکیل کی حیثیت سے انہیں کلکتہ پہنچایا۔ یہاں سر چارلس میڈکاف سے ان کی ملاقات ہونے پر انہیں شاداں نے امیرنامہ نذر کیا۔ میڈکاف شاداں کی علمی صلاحیت سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ انہوں نے اپنے سکرٹری سے فرمایا ”ایسا قابل وکیل اب تک غالباً کوئی نہیں آیا ہوگا۔“ نواب صاحب کی خواہش پر شاداں واپس ٹونک آ گئے تھے۔ یہیں اسی سال ذی الحجہ میں ان کا انتقال ہوا۔ اس طرح بساوں لال شاداں ۱۸۱۴ء سے ۱۸۳۶ء تک ریاست ٹونک سے وابستہ رہتے ہوئے اپنے منصب کے علاوہ علمی و ادبی کارہائے نمایاں بھی انجام دیتے رہے۔ امیرنامہ ہی ان کا وہ ادبی اور تاریخی کارنامہ ہے جو انہیں تاریخ ہند میں زندہ جاوید رکھنے کے لئے کافی ہے۔

شعری صلاحیات :

بساوں لال شاداں کی تصنیف امیرنامہ اگرچہ ایک نثری و سوانحی تخلیق ہے لیکن اس کتاب میں شاداں کی شاعرانہ قدرت بھی باصرہ نواز ہوتی ہے۔ شاداں نے اپنے نسکین ذوق کے لئے متعدد

موقعوں پر واقعات کے دوران بیان کثرت سے فارسی اشعار تحریر کیے ہیں۔ امیرنامہ کی ابتداء حمدیہ اشعار سے ہوتی ہے، اولین حمدیہ شعر اس طرح ہے :

بنام جہاں دارکون و مکاں کف و شکست است در حکم آل

ترجمہ: کون و مکاں کے اس سپہ دار کے نام سے شروع کرتا ہوں جس کے حکم میں فتح و شکست ہے۔

امیرنامہ کا اختتام بھی فارسی اشعار پر ہوتا ہے۔ دراصل شاداں فی الفور شاعری پر قادر ہونے کے ساتھ کئی اصنافِ سخن میں یدِ طولی رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنی تصنیف میں نظم، قصیدہ، زبائی اور قطعات وغیرہ کو حسب موقع شامل کیا ہے۔ شاداں نے اردو میں نواب امیر خاں کی مدح میں ایک مثنوی بھی تحریر کی تھی، جس کا ذکر لالہ سری رام نے اپنی تصنیف ”خم غانہ جاوید“ میں حصہ چہارم کے صفحہ ۷۵ پر کیا ہے مگر اب یہ مثنوی نایاب ہے۔ منشی دہبی پر شاداں نے تذکرہ ”آثار الشعراء ہندو“ میں لکھا ہے کہ ”شاداں نے اردو میں ایک مثنوی کھٹل نامہ بھی لکھی۔“

(آثار الشعراء ہندو: دہبی پرشاد ۱۸۸۵ء، رضوی پریس، دہلی، ص ۷۶)

مثنوی کے دو اشعار ملاحظہ ہوں :

ذکر کھاٹوں کا بچھے گر ارقام نقطے کاغذ کے کاٹتے ہیں مدام

کھٹملوں سے دوات ہے لبریز رنگ سیاهی کا شگرت آمیز

شاداں کی ایک رباعی بھی مذکورہ تذکرے میں موجود ہے، جو اس طرح ہے۔

گل گلاب نے خوبی بچ دکھائی ہے بہار جامہ لگلوں پہن کے آئی ہے

جو پوچھو بچ تو یہ ہے برکت قدم حضور و گردنگ نے یہ خوبی کہاں سے پائی ہے۔

امیرنامہ اپنے نثری اوصاف کے علاوہ شاعرانہ حسن سے بھی مالا مال ہے۔ مذکورہ تخلیق میں دکن کے امراء ہولکری کی مندر نشینی، نواب امیر خاں کی بے خوف شجاعت، ہولکری کی وفات پر تاریخی اشعار، راجپوتانہ کی شہسوار کی تصویر کشی، منہل شہر کے علاوہ نذر باغ اور رنگین کوٹھی کی تعریف، امیرنامہ کی تکمیل ہونے پر نواب امیر خاں کی مدح و ستائش، نواب وزیر الدولہ وغیرہ کی مدح مؤثر اور دلکش الفاظ میں نہایت ہی ہنرمندی سے شاعری میں کی گئی ہے۔ ان کی شاعری میں تاریخ گوئی کے نمونے بھی جا بجا موجود ہیں۔ جس سے نثر کے ساتھ شاعری و تاریخ و گوئی میں بھی ان کی مہارت تامہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

امیرنامہ کے تراجم :

امیرنامہ کے اولاً انگریزی زبان میں تراجم ہوئے۔ اس کے بعد اردو اور ہندی زبانون میں کئی تراجم ہوئے ہیں۔ فارسی میں مولوی نجف علی جھجھری نے سہمت ۱۲۲۸ میں انبیا امیرنامہ کے عنوان سے نثر و نظم میں امیرنامہ سے متعلق واقعات بصورت ترجمہ تحریر کیے تھے، جو اب گمنام و ناپید ہیں۔ اسی طرح ۱۸۳۱ء میں جنرل میڈکاف کے حکم سے جان بولی صاحب نے کلکتہ میں امیرنامہ کا انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔ یہ ترجمہ بھی اب ناپید و گمنام ہے۔ انگریزی زبان میں ایک اہم ترجمہ ٹی۔ ہنری پرنسپ نے لارڈ ولیم بینٹن کے حکم سے مئی ۱۸۳۲ء میں کیا تھا، جو اسی سال شائع بھی ہوا۔ اس سے قبل کے مذکورہ دونوں تراجم ناپید و گمنام ہونے کے سبب ٹی ہنری پرنسپ کے ترجمے کو ہی اولیت حاصل ہے۔ امیرنامہ کا ایک منظوم ترجمہ فارسی زبان میں ۱۸۳۵ء میں پائندہ خاں کلبت رامپوری نے کیا تھا۔ جس کا اردو میں ترجمہ عصر حاضر میں ٹونک کے معروف میٹرنسخن ابن احسن بزجی نے کیا تھا۔ مذکورہ ترجمہ شائع نہ ہو سکا۔ فارسی زبان میں ایک منظوم ترجمہ حکیم سلطان محمود خاں نے ۱۲۸۳ھ میں کیا۔ یہ ترجمہ بھی اب گمنام و ناپید ہے۔

اردو زبان میں امیرنامہ کا اولاً ترجمہ کپتان جے۔ بلیئر کے حکم سے مولوی حکیم سید احمد علی سیماہ نے کیا تھا (جس کا ذکر مختلف حوالوں سے کتب میں ملتا ہے) دوسرا ترجمہ اردو میں ان



پطرس بخاری: اردو کا نمائندہ طنز و مزاح نگار

اصل نام سید احمد شاہ اپنے قلمی نام پطرس بخاری سے معروف تھے۔ ان کی پیدائش یکم اکتوبر 1898 کو ہوئی۔ پطرس ایک ذہین ادیب تھے۔ ان کا مطالعہ بہت گہرا اور معلومات وسیع تھیں۔ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں پر یکساں عبور تھا۔ ساٹھ سال کی عمر تک انہیں ساٹھ سترہ سی سات آٹھ کتابیں لکھنی چاہئے تھیں مگر وہ پیشہ ورا نشاء پر داز نہیں تھے۔ جب جی چاہا لکھتے اور جب تک جی نہیں چاہتا تھا نہیں لکھتے تھے۔ چنانچہ ابتدا سے ہی ان کی یہی روش رہی۔ زیادہ لکھنا کوئی خوبی کی بات نہیں ہے بعض ایسے زونوئیس ہوئے ہیں جن کی بیسوں کتابیں چھپیں مگر بارہ پندرہ سال بھی ان کتابوں نے زندگی نہیں پائی۔ آج ان کی کتابیں تو کیا نظر آئیں گی نام بھی سننے کو نہیں ملتے۔ ان کے مقابلے میں بعض ایسے بھی کم نوئیس نظر آتے ہیں جن کی کتابیں گئی چنی ہیں مگر انہیں سر آنکھوں پر لئے پھرتے ہیں۔ انہیں آخر الذکر میں پطرس بخاری کا بھی شمار ہے۔ چند مضامین، چند ترجمے، چند ناول بس یہی کائنات پطرس کی ہے۔ مگر ان کی نگارشات ادبی قدر و قیمت میں بہتر سے بہتر ہیں۔ وہ اردو کے نامور مزاح نگار، افسانہ نگار، مترجم، شاعر، نقاد اور معلم تھے۔ ان کا شمار متحدہ ہندوستان میں نشریات کے بانیوں میں ہوتا ہے۔

پطرس اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ فرائض منصبی کی گونا گوں مصروفیات کے باوجود انہوں نے علم و ادب کی خدمت کا موقع کمال لیا اگرچہ ان کی تحریریں کم ہیں مگر جتنی بھی ہیں ادبی اعتبار سے اعلیٰ معیار کی حامل ہیں۔ پطرس کے مضامین ظرافت سے پر ہیں انہوں نے خالص ظرافت کو اپنی تحریروں میں اپنایا۔ خالص ظرافت کا رجحان اردو ادب میں بہت کم پایا جاتا ہے۔ دراصل اردو میں ظرافت کی کہانی طنز کی کہانی ہے۔ اردو میں خالص ظرافت کے مقابلے طنز کا فروغ زیادہ ہوا ہے۔ کیونکہ خالص ظرافت کے لئے جن اسباب کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس زمانے میں ناپید تھے۔ خالص ظرافت کے لئے سکون و عافیت کا ہونا ضروری ہے لیکن اردو میں طنز کا فروغ ایک طویل سیاسی کشمکش اور تصادم کا دور ہے۔ ایسے میں خالص ظرافت کے بجائے طنز کے فروغ کے لئے فضا زیادہ سازگار تھی۔ خالص مزاح کے فروغ کے لئے دوسری چیز زندگی کے تئیں ہمدردانہ انداز نظر، زندگی سے اس اور ان کی ناہمواریوں کا تبسم کے ساتھ خیر مقدم کرنا ضروری ہے اور یہ رجحان اردو میں عام طور پر ناپید رہا ہے۔ زندگی کے تئیں نفی کا رجحان اردو میں زیادہ فروغ پایا ہے۔ اس وجہ سے اردو ادب میں، بہت کم ایسے ادیب گذرے ہیں جنہوں نے زندگی کی صعوبتوں کو تبسم کے ساتھ خیر مقدم کیا ہو اور اپنی اعلیٰ حسگی کے بنا پر زندگی کے ساتھ اس کا انداز نظر ہمدردانہ رہا ہو۔ انہیں چند لوگوں میں پطرس بھی ہیں۔ پہلے غالب کے خطوط میں ہمیں خالص مزاح کے نقوش ملتے ہیں۔ غالب نے بھی زندگی سے فرار حاصل کرنے کے بجائے اس سے قریب تر ہو کر سینے سے لگانے کی کوشش کی تھی۔ زندگی کے تئیں یہی انداز ہمیں پطرس کے یہاں بھی ملتا ہے۔ پطرس نے بھی اپنے زمانے کے شدید فکری اور احساسی بحران کے باوجود زندگی کو پیار بھری نظروں سے دیکھا۔ زندگی میں مصیبت اور بحران کے باوجود اس سے مخلوط ہونے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ زندگی کے تئیں اسی مثبت رویے کی وجہ سے ان کے مضامین میں ظرافت کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔

پطرس بخاری نے واقعات کے بیان میں لفظوں کے انتخاب اور جملوں کی بنت اتنی خوبصورتی سے کی ہے کہ مزاح سے مل کر ان کی تحریر اور خوبصورت اور دلکش بن گئی ہے۔ قاری ان کی تحریروں کو جیسے جیسے پڑھتا ہے ویسے ویسے فلم کی طرح سب کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے چلنے لگتا ہے۔ ان کی تحریروں کی ایک خوبی یہ ہے کہ انہوں نے محاوروں اور کہاوتوں کے ذریعہ بھی مزاح پیدا کیا ہے۔ اس طرح ان کی تحریروں میں جگہ جگہ استعارات بھی نظر آئیں گے۔ اس کے ذریعہ بھی انہوں نے واقعی تصویر اور مزاحیہ کے رنگ کو دلکش بنایا ہے۔

”پطرس کا ذوق مزاح نہایت بلند ہے۔ ان کا مزاح لفظی قلابازیوں، تخریب و فتنیت اور عمل مذاق سے پیدا نہیں ہوتا۔ انہوں نے زندگی کے مضحک پہلوؤں کی نقاب کشائی کرتے وقت یا کردار کی بوجھلیوں یا صورت واقع کی ناہمواریوں کو اجاگر کرتے ہوئے ایک ہمدردانہ انداز نظر کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان کے مزاح میں خلوص، صحت مند کیفیات اور سادگی سے پطرس اپنے آپ کو زیادہ تر مزاح کا نشانہ بناتے ہیں اور اس کے ساتھ وہ دوسروں کو بھی شریک کر لیتے ہیں۔ اپنے اوپر ہنستے ہوئے بھی تحقیر آمیز رویہ اختیار نہیں کیا ہے بلکہ اس میں توازن و اعتدال اور شخصی وقار کا خیال رکھا ہے۔ چونکہ انہوں نے اکثر مضامین واحد متکلم کی صورت میں لکھے ہیں اس لئے واضح ہوتا ہے کہ ان کے مزاح کا رخ خود ان کی طرف ہے۔ واحد متکلم کا استعمال ان کے اسلوب کی خاص خصوصیات ہے مثلاً ان کے مضامین ”مرحوم کی یاد میں“، ”مرید پور کا پیر“، ”سویرے جو کل میری آنکھ کھلی“، ”کسے“، ”ہوشل میں پڑھنا“ مزاح کی شاہکار ہیں۔“

ہے وہ واقعہ کی مختلف کڑیوں کو اس انداز سے مربوط کرتے ہیں کہ مضحک کیفیات کی نمود بخشی شعوری کاوش کا نتیجہ معلوم نہیں ہوتا بلکہ خود حالات و واقعات سے ابھرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔“

(انتخاب مضامین پطرس، مرتبہ: وجاہت علی سندیلوی، ص: 34)

پطرس کا ذوق مزاح نہایت بلند ہے۔ ان کا مزاح لفظی قلابازیوں، تخریب و تشویش اور عمل مذاق سے پیدا نہیں ہوتا۔ انہوں نے زندگی کے مضحک پہلوؤں کی نقاب کشائی کرتے وقت یا کردار کی بوجھیں یا صورت واقع کی ناہمواریوں کو اجاگر کرتے ہوئے ایک ہمدردانہ انداز نظر کا مظاہر کیا ہے۔ ان کے مزاح میں خلوص، صحت مندی کیفیات اور شادابی سے پطرس اپنے آپ کو زیادہ تر مزاح کا نشانہ بناتے ہیں اور اس کے ساتھ وہ دوسروں کو بھی شریک کر لیتے ہیں۔ اپنے اوپر ہنستے ہوئے بھی تحقیر آمیز رویہ اختیار نہیں کیا ہے بلکہ اس میں توازن و اعتدال اور شخصی وقار کا خیال رکھا ہے۔ چونکہ انہوں نے اکثر مضامین واحد متکلم کی صورت میں لکھے ہیں اس لئے واضح ہوتا ہے کہ ان کے مزاح کا رخ خود ان کی طرف ہے۔ واحد متکلم کا استعمال ان کے اسلوب کی خاص خصوصیات ہے مثلاً ان کے مضامین ”مرحوم کی یاد میں“، ”مرید پور کا پیر“، ”سورے جو کل میری آنکھ تھی“، ”کتے“، ”ہوٹل میں پڑھنا“ مزاح کی شاہکار ہیں جن میں اپنے واسطے سے زندگی کی مضحک کیفیات اور ناہمواریوں کو مزاح کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کا مضمون ”مرحوم کی یاد میں“ مزاح کا بہترین نمونہ ہے۔ اس میں پطرس زندگی کی تلخ حقیقتوں کو بڑے شگفتہ اور مزاحیہ انداز میں اجاگر کیا ہے۔ پورے مضمون میں قاری کہیں بھی زندگی کی کھردری حقیقت کی تلخی محسوس نہیں کرتا بلکہ واقعات اور اسلوب کی پیدا کردہ مضحک کیفیات میں کھو جاتا ہے۔ اتنے بڑے مضمون میں پطرس اپنے شگفتہ اور رنگین اسلوب کے ذریعہ قاری کو کہیں بھی بیزار نہیں ہونے دیتے۔ وہ واقعات کی مختلف کڑیوں کو اس قدر وائی اور برجستگی کے ساتھ مربوط کرتے جاتے ہیں کہ مزاح کی دلچسپی اور شگفتگی کہیں بھی کم نہیں ہوتی۔ قاری اگر مضمون پڑھنا شروع کر دے بنا ختم کئے دم نہیں لیتا اور قاری ہر جگہ مزاح کی پھلجھڑیوں سے دوچار ہوتا رہتا ہے۔ کہیں کہیں تبسم کی کیفیت قہقہہ تک پہنچ جاتی ہے۔ پطرس کے مزاح میں مسلسل دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ یہ سب ان کے آسان عام فہم مگر شگفتہ اسلوب کا کمال ہے۔ پطرس اپنے مزاح کے لئے استعارات اور تشبیہات کا استعمال نہیں کرتے بلکہ نہایت سادہ اور سلیس زبان میں لکھتے ہیں۔ ان کا انداز ایسا ہے جیسے وہ بے تکلف قاری سے گفتگو کر رہے ہوں۔ ان کی تحریر میں روزمرہ زبان میں چھوٹے چھوٹے تبسم آتے ہیں جملے قاری کو خندہ آور کیفیات سے دوچار کرتے ہیں۔ ان کی عبارات میں کہیں بھی رکاوٹ محسوس نہیں ہوتی۔ روانی، برجستگی اور شگفتگی ان کے اسلوب کی خصوصیت ہے۔ ان کے اسلوب کا ذکر کرتے ہوئے احمد جمال پاشا لکھتے ہیں:

”پطرس کی زبان میں بیان کی خوبیاں موجود ہیں۔ سادگی، شگفتگی، آمد روانی، دلچسپی یہ سب خوبیاں ان کو صاحب طرز بنادیتی ہیں۔ ان کا اسلوب زبان و بیان کی لطافتوں سے مالا مال ہے۔ اس میں ظرافت کے لئے نہ وہ الفاظ کے گھروندے بناتے ہیں نہ الفاظ کی چاشنی کا سہارا ڈھونڈتے ہیں اس حسن بیان میں ایسی سادگی ہوتی ہے گو یادہ قاری سے بے تکلف گفتگو کر رہے ہوں۔“

(انتخاب مضامین پطرس، مرتبہ: وجاہت علی سندیلوی، ص: 35)

پطرس کی زبان کے بارے میں بعض لوگوں نے اعتراض کیا ہے کہ وہ غلط اردو لکھتے ہیں بلکہ زبان و قواعد کی غلطی ان کے ابتدائی مضامین تک ہی محدود ہے۔ اعتراض کے بعد وہ زبان و قواعد کی طرف دھیان دینے لگے اور غور و فکر کے بعد ہی الفاظ کا انتخاب کرنے لگے۔ اس طرح ان کی زبان میں چاشنی اور روانی اس قدر پیدا ہو گئی کہ ان کی ابتدائی غلطیوں کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ رشید احمد صدیقی ان کی زبان کی غلطیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ان کے دیباچے کے متعلق لکھتے ہیں:

پطرس بلا کے ذہین اور تیز طرار تھے۔ وہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے مزاح کا پہلو نکال لیا کرتے تھے۔ ہر چیز کو مزاح کے نقطہ نظر سے دیکھتے تھے۔ دراصل وہ زندگی سے بیزار نہیں تھے بلکہ وہ چاہتے تھے کہ زندگی کی مختلف کیفیات سے مسرت حاصل کی جائے۔ ان کی ظرافت صرف تقریباً نہیں تھی۔ اپنے غیر معمولی مشاہدہ و بوجھ اور غور و فکر کے ذریعے زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو مزاح کے ساتھ پیش کرنا ان کا فطری رجحان بن گیا تھا۔ بقول احمد جمال پاشا:

”اگر گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ واضح ہو جائے گا کہ ان کا مقصد تفریح ہرگز نہیں تھا۔ وہ اپنی ذات سے بلند ہو کر سوچتے تھے، قدرت نے انہیں ایسی غیر معمولی اور سدہا رہا طبیعت عطا کی تھی جس کی گہرائی اور ذہانت نے ان کی مزاح نگاری کو ان کا بالکل فطری مشغلہ بنا دیا تھا۔“

(پطرس بخاری، مضامین پطرس، ص: 11-10)

پطرس کو مغربی ادب پر کافی عبور حاصل تھا اور اس سے انہوں نے فائدہ بھی اٹھایا اور مغربی ادب کی رعنائیوں اور لطافتوں کو اردو ادب میں سمونے کی کوشش بھی کی۔ مگر انہوں نے مغربی اثرات کو بڑے بالواسطہ طریقے سے اردو میں برتا ہے کہیں سے بھی ایسا نہیں لگتا ہے کہ انہوں نے مغربی ادب کی نقالی کی ہے بلکہ انگریزی اثرات کو مقامی رنگ میں ڈھال کر اردو ادب میں برتا ہے۔ انگریزی ادب سے ان کی شائستگی کا یہ نتیجہ نکلا کہ انہوں نے خالص مزاح کے حربوں سے اپنی تحریر کو سجا لیا۔ ہمارا خالص مزاح جس میں ابھی تک ہزل، ہچکڑ اور عامیانہ پن کے عناصر تھے یک لخت بڑی سنجیدگی ہوئی کیفیات کا حامل بن گیا۔ پطرس پر انگریزی ادب کے بالواسطہ اثرات کا ذکر کرتے ہوئے وزیر آغا لکھتے ہیں:

”پطرس جیسا کہ اوپر ذکر ہوا اور دوش میں اس خالص مزاح کے سب سے بڑے علمبردار ہیں اور اگرچہ ان کے سوچنے کا انداز اور مزاح نگاری کے حربوں کا استعمال انگریزی اثرات کا غماز ہے لیکن یہ اثرات اتنے بالواسطہ ہیں اور انہوں نے اپنے معاشرے کے پس منظر کو اس درجہ ملحوظ رکھا ہے کہ ان کی نگارشات خالص تخلیقی ادب کا درجہ اختیار کر گئی ہیں۔“

(پطرس بخاری، مضامین پطرس، ص: 17)

پطرس نے مزاح نگاری کے فطری انداز کو اپنی تحریروں میں مغربی ادب کی رعنائیوں اور لطافتوں کے ساتھ سمو لیا ہے۔ اس سبب سے ان کی تحریروں میں تسلسل، روانی اور انتخاب ہے۔ وہ جانتے تھے کہ کیا لینا چاہئے اور کیا چھوڑنا چاہئے۔ اپنی ذہانت کے ذریعے زندگی کے بنیادی کوششوں کو روشنی میں لے آئے ہیں۔ پطرس کے موضوعات بالکل سیدھے سادے اور روزمرہ زندگی سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اس سادگی میں بے پناہ سنجیدگی ہے اور اس سنجیدگی میں ایسی غیر محسوس ذہنی منطق ہے جو بالکل چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑے بڑے نتائج اخذ کر لیتی ہے۔

ویسے تو پطرس نے مزاح کے سارے حربوں کو کام میں لایا ہے توازن، مقابلہ، کردار، واقعہ اور اسٹائل سب سے مل کر ان کے مزاح کا تانا بانا بنایا گیا ہے لیکن غور کیا جائے تو معلوم ہوا کہ ان کی ظرافت دراصل واقعہ کی مرہون منت ہے۔ واقعہ کے ذریعہ انہوں نے کمال کا مزاح پیدا کیا ہے وہ واقعہ کی مختلف کڑیوں کو باہم مربوط اس طرح کرتے ہیں اور اس کی مضحک کیفیات کو فطری انداز میں یوں اجاگر کرتے ہیں کہ قاری خندہ آور ہوئے بغیر نہیں رہتا اور ان مضحک کیفیات کو اجاگر کرنے میں ان کی شعوری کوشش کا دل نہیں ہوتا ہے۔ بقول وزیر آغا:

اس میں کوئی شک نہیں کہ پطرس کی مزاح نگاری کو مزاحیہ تقابل، مزاحیہ کردار اور اسٹائل کی خندہ آور کیفیات سے تقویت ملتی ہے تاہم دراصل ان کی مزاح نگاری کا طرہ امتیاز وہ مضحک کیفیات ہیں جو صورت واقعہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ پطرس کو صورت واقعہ کی تعمیر کا ایک خاص سلیقہ

”یہ دیا چہ نہیں غزل ہے جو شخص ایسی غزل لکھ سکتا ہے اس کے سارے قصور معاف کئے جاسکتے ہیں خواہ وہ غلط اردو ہی لکھتا کیوں نہ ہو۔“

(انتخاب مضامین بطرس، بطرس، مرتبہ: وجاہت علی سندیلوی ص: 37)
جس دیا بچے کو رشید احمد صدیقی نے غزل کہا ہے اس میں ظرافت کی چاشنی ملاحظہ کیجئے:
”اگر یہ کتاب آپ کو کسی نے مفت بھیجی ہے تو مجھ پر احسان کیا ہے، اگر آپ نے نہیں سے چرائی ہے تو میں آپ کے ذوق کی داد دیتا ہوں، اپنے پیسوں سے خریدی ہے تو مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔ اب بہتر یہی ہے کہ آپ اس کتاب کو اچھا سمجھ کر اپنی حماقت کو حق بجانب ثابت کریں۔“

(انتخاب مضامین بطرس، بطرس، مرتبہ: وجاہت علی سندیلوی ص: 38)
اس اقتباس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں واقعات کے مزاح کے ساتھ خیال کا بھی مزاح موجود ہے۔ اس مزاح کو پیدا کرنے میں بطرس کے الفاظ بھی بہت معاون ثابت ہوتے ہیں۔ خیال کا مزاح ان کے یہاں دوسری جگہ بھی نظر آتا ہے۔ بطرس معمولی واقعات کو بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کر کے مزاح کا پہلو نکال لیتے ہیں اور زبان و بیان کی سادگی اور شگفتگی کے ذریعہ معمولی واقعات میں دلچسپی پیدا کرنے کا فن انہیں خوب آتا ہے۔ بطرس کا مضمون ”کتے“ ایک شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔ اس میں کتے کے بھونکنے کو جو ایک معمولی واقعہ ہے اسے شگفتہ اسلوب کے ذریعے اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ہر جملے میں مزاح کی گدگد اہٹ، اور زبان و بیان کی چاشنی کو محسوس کر سکتے ہیں۔ مضمون کی شروعات ہی قہقہہ انگیز ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

”علم الجیوانات کے پروفیسروں سے پوچھا، سلوڑیوں سے دریافت کیا خود سر کھپاتے رہے لیکن سمجھ میں نہ آنا کہ آخر کتوں کا فائدہ کیا ہے۔ گائے کو لیجئے دودھ دیتی ہے، بکری کو لیجئے دودھ دیتی ہے اور مینگیلیاں بھی۔ یہ کتے کیا کرتے ہیں۔ کہنے لگا کہ کتا وفادار جانور ہے۔ اب جناب وفاداری اسی کا نام ہے کہ شام کے سات بجے سے جو بھونکنا شروع کیا تو لگا تار بغیر دم لئے صبح کہ چھ بجے تک بھونکتے چلے گئے تو ہم لٹنڈو رہے ہی بھلے۔“

(انتخاب مضامین بطرس، بطرس، مرتبہ: وجاہت علی سندیلوی ص: 38)
بطرس ہنگامی مسائل اور موضوعات میں نہیں الجھے بلکہ معمولی اور آفاقی مسائل کو روزمرہ زندگی سے انتخاب کر کے ان کے مختلف گوشوں کو مزاحیہ انداز میں اجاگر کرتے ہیں۔ عام فہم اور روزمرہ کی زبان میں مزاح کا ابھارنا انہیں خوب آتا ہے۔ ”مرحوم کی یاد میں“ آفاقی موضوعات کو اپنایا ہے۔ جیسے دوست کی دھوکہ بازی اور مصومیت کا استحصال ان موضوعات کو بالکل کے واقعہ سے جوڑ کر اپنے شگفتہ اور سششتہ انداز میں بیان کیا ہے کہ قاری مزاح کی لطافت اور عبارت کے روانی اور برکتی سے ہر جگہ دوچار ہوتا ہے۔ ایک اقتباس میں بالکل چلانے کی منظر کشی ملاحظہ کیجئے:

”آخر بالکل پر سوار ہوا۔ پہلا ہی پاؤں چلایا تو ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی مردہ اپنی ہڈیاں چٹخا چٹخا کر اپنی مرضی کے خلاف زندہ ہو رہا ہے۔ گھر سے نکلتے ہی کچھ تھوڑی سی اترائی تھی اس پر بالکل خود بخود چلنے لگی لیکن اس رفتار سے جیسے تارکول زمین پر بہتا ہے اور ساتھ ہی مختلف حصوں سے طرح طرح کی آوازیں برآمد ہونی شروع ہوئیں ان آوازوں کے مختلف گروہ تھے جس میں چال چوں کی قسم کی آوازیں زیادہ تر گدی کے نیچے اور پچھلے پہنے سے نکلتی تھیں۔ کھٹ کھڑ کھڑ کے قبیل کی آوازیں منگاڑوں سے آتی تھی۔۔۔۔۔ جب کبھی پیڈل پر زور ڈالتا تھا زنجیر میں ایک انگڑائی سی پیدا ہوتی تھی جس سے وہ تن جاتی تھی اور چڑچڑبولنے لگتی تھی۔۔۔۔۔ جب اتار پر

بالکل ذرا تیز ہوئی تو فضا میں ایک بھونچال سا آسمان اور بالکل کے کبھی اور پرزے جواب تک سورہے تھے بیدار ہو کر گویا ہوئے۔“

(انتخاب مضامین بطرس، بطرس، مرتبہ: وجاہت علی سندیلوی ص: 78)
بطرس نے اس اقتباس میں کتنی دلچسپ اور بہترین تصویر کشی کی ہے۔ وہ واقعات کی تصویر کشی بہت عمدہ کرتے ہیں۔ جزئیات نگاری میں عام الفاظ کا کتنے انوکھے انداز میں استعمال کیا ہے۔ ان کے روزمرہ کے تشبیہات اور استعارات میں ندرت اور جدت پائی جاتی ہے۔ اس اقتباس میں برکتی اور روانی و سلاست بھرپور طریقے سے موجود ہے۔ ان کے تمام تحریروں کی یہی خاصیت ہے۔ بطرس الفاظ کے حسن کاراندہ استعمال سے مزاح کا جادو دکھاتے ہیں۔

بطرس بھناری کے مضامین کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ ان کا مزاح بالکل خالص ہے یعنی انہوں نے اپنے مضامین میں خالص مزاح کو جگہ دی ہے۔ وہاں کسی کا مذاق اڑانا یا کسی پر کچڑ اچھالنا یا کسی پر طنز کرنا ان کا مقصد ہرگز نہیں بلکہ ان تمام چیزوں سے خود کو بچاتے ہوئے صاف ستھرا اور خالص مزاح کا نمونہ پیش کیا ہے۔

بطرس نے واقعہ اور خیال کے علاوہ پیر وڈی اور تحریف سے بھی بھرپور مزاح پیدا کیا ہے۔ انہوں نے مولوی اسماعیل میرٹھی کی کتاب اردو کی آخری کتاب کی بڑی عمدہ پیر وڈی کی ہے۔ زبان و بیان کی مخصوص ترتیب اور الٹ پھیر کے ذریعے خوبصورت مزاح کی تخلیق کی ہے۔ اس کی ایک مثال دیکھئے:
”ماں بچے کو گود میں لئے بیٹھی ہے، باپ انگوٹھا چوس رہا ہے اور دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ بچہ حب معمول آٹھیں کھولے پڑا ہے۔ ماں محبت بھرے نگاہوں سے اس کے منہ کو تک رہی ہے۔“

(رشید احمد صدیقی، طنزیات و مضحکات ص: 211)
لاہور کے جغرافیہ میں بھی کامیاب پیر وڈی کی ہے۔ مجموعی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کے فن کے تمام امتیازات الفاظ کے حسن کاراندہ استعمال کا ثبوت ہیں اور ان کی زبان دانی کی رین منت بھی۔ انہیں زبان و بیان پر قدرت حاصل تھی اور ساتھ ہی ساتھ مغربی ادب سے اچھی طرح شناسائی بھی اس طرح سے وہ اپنے فن کے ذریعہ معمولی واقعہ کو بھی زعفران دار بنا دیتے تھے۔ اسی وجہ سے ان کے مضامین میں مزاح کی عمدہ مثال کی کمی نہیں اور ان کے یہاں فکر و فن کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ تمام مزاح نگاروں میں الفاظ کے استعمال کے اعتبار سے انہیں انفرادیت حاصل ہے۔

□□□

التماس

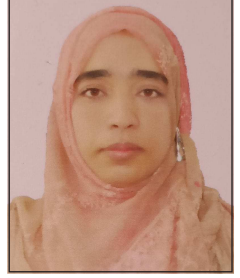
”ماہنامہ نیا دور“ کو ارسال کیے جانے والے مضامین اور تخلیقات کا معیاری ہونا ضروری ہے اور مسودات کمپوز شدہ، مکمل ایڈریس، موبائل نمبر اور تصویر کے ساتھ ہونا لازمی ہے۔ ایسا نہ ہونے کی صورت میں اشاعت ممکن نہیں ہوگی۔

ادارہ۔۔

جمشیدہ جہاں آرا

اسٹنٹ پروفیسر گاندمل ڈگری کالج، کشمیر یونیورسٹی سرینگر

9797925895



میر غلام رسول ناز کی شاعری پر اقبال کے اثرات

میر غلام رسول ناز کی جموں و کشمیر کے صنف اول کے شعراء میں شمار ہیں۔ اردو کشمیری دونوں زبانوں کے شاعر ہیں۔ ناز کی یہاں غزل، قطعات اور نظمیں بھی ملتی ہیں۔ ناز کی اقبال، جوش اور پیکلست کی انقلابی شاعری سے بے حد متاثر تھے۔ ناز کی کواصناف سخن میں صنف رباعی اور صنف قطعہ پر خاص مہارت حاصل ہے۔ ان کی شاعری کا بیشتر حصہ نعتیہ کلام پر مشتمل ہے۔ انہیں حبیب خدا سے گہرا عشق تھا۔ میر غلام رسول ناز کی نے اپنے دور کی اردو کی مروجہ روایت میں اپنے تخلیقی شعور کے عمدہ نمونے پیش کئے ہیں۔ نئے فکری اور جمالیاتی میدانوں کی جانب بھی قدم بڑھایا۔ غزل کے علاوہ بھی انہوں نے نثریہ اور نظمیں اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی دیگر خصوصیات کے ساتھ ساتھ غزل میں تنوع کی دوسری راہیں ہموار ہوئیں۔ ان کے یہاں انسانی فطرت کو حقیقت کے طور پر برتنے کا رجحان موجود ہے۔ انہوں نے سماجی و وطنی، تاریخی، معاشرتی تصورات کو جدید مفامیں میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔ اس طرح ان کے یہاں ایک الگ طرح کا چاؤ نظر آتا ہے۔

ناز کی نے جس دور میں اپنی شاعری کا آغاز کیا وہ کشمیر میں تحریک آزادی کا دور تھا۔ کشمیری عوام کو اپنی مظلومیت، کمپرسی اور معاشی بدحالی کا شدت سے احساس ہو چکا تھا۔ اس وقت ایک طرف کشمیریوں پر ظلم و جبر کے خلاف احتجاج کی لے تیز ہو رہی تھی تو دوسری طرف قوم فلاح و بہبود کے لئے کام ہو رہا تھا۔ قوم میں حب الوطنی کا جذبہ بڑھ رہا تھا۔ وطنی، قومی، منطری، پیما، اصلاحی، اخلاقی اور ملی شاعری کا رجحان بڑھنے لگا تھا۔ اس دور میں اقبال کی شاعری جموں و کشمیر کے شعراء کے لئے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ وہ جموں و کشمیر کے شعراء بالخصوص کشمیر کے شعراء کو شدت سے متاثر کرنے لگے۔ کشمیر کے شعراء میں اقبال کے فکروں اور اسلوب و آہنگ سے سب سے زیادہ میر غلام رسول ناز کی متاثر ہوئے ہیں کیونکہ ناز کی اردو اور فارسی شعری روایات کا خاصا عرفان رکھتے تھے۔ ان کی شاعری کا بیشتر حصہ اقبال کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ محمد اسد اللہ وانی اپنے مقالہ میں لکھتے ہیں:

”اقبال سے متاثر ہونے کا اعتراف ناز کی خود کرتے ہیں وہ ان کے کلام کو زندگی کے آغاز سے ہی اپنا جزو جان تسلیم کرتے ہیں اور ان کے اکثر کلام کا زبر ہونے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں اسی لئے انہیں اقبال کا حافظ بھی کہا جاتا ہے۔“

ناز کی کی شاعری کا مطالعہ کرنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے اقبال کی استعمال کی ہوئی اصطلاحیں اور علامتیں ان کے اشعار میں نہ صرف اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہیں بلکہ ان کی تمام شاعری اقبال کے اثرات کی نمائندگی کرتی ہے۔

جو میں سر پہ سجود ہوا کبھی تو زمین سے آنے لگی صدا

تیرا دل تو صنم آشا ہے تجھے کیا ملے گا نماز میں

اقبال

نہ سرور میرے رکوع میں، نہ حضور میرے سجود میں

نہ نظام میرے قیام میں، نہ گداز میری نماز میں

ناز کی

قطعہ نگاری میں وہ بہت ہی مشہور تھے۔ ان کو اس فن میں بہت ہی مہارت حاصل ہے۔ علامہ اقبال کا اثر ناز کی کے قطعات پر زیادہ گہرا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی نظموں، رباعیوں اور غزلیات میں بھی اقبال کے اثرات کی نشاندہی ہو سکتی ہے۔ ان کی نظم کا عنوان بھی اقبال کے ایک شعری مجموعے ”بانگ درا“ کا ہی نام رکھا ہے۔ پروفیسر حامدی کشمیری اس حوالے سے لکھتے ہیں:

”میر غلام رسول ناز کی کے یہاں اور بھی موضوع ہیں جن پر اقبال کے اثرات صاف دکھائی دیتے ہیں۔ جیسے عقل و عشق، حرکت و عمل دور حاضر کی صورتحال، زوال معاشرہ، خودی وغیرہ شامل ہیں۔ اقبال کی نظم میں انسان ایک عظیم ہستی ہے۔ وہ اشرف المخلوقات ہے۔ عظمت انسان اقبال کی شاعری کے بنیادی موضوعات میں شمار ہے۔ ناز کی بھی اقبال کی طرح عظمت آدم کے ہی گیت گاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

میر غلام رسول ناز کی کی شاعری سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو و فارسی شعری روایت کی نفاست اور رنگارنگی کافی حد تک ان کے تخیل میں جذب ہو چکی ہے۔ فارسی الفاظ و تراکیب سے ان کا شغف نمایاں ہے لیکن دیگر الفاظ سے بھی انہوں نے اپنی شاعری میں جو کام کیا ہے، وہ جہاں ان کی قادر الکلامی کے ثبوت فراہم کرتا ہے وہیں لفظوں کو برتنے کا صحیح سلیقہ بھی رکھتے ہیں۔ ناز کی کے کلام پر اقبال کا اتنا زیادہ اثر ہے کہ ان کی شاعری کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جہاں اقبال کا اثر نمایاں نہ ہو۔ ناز کی کے ہر شعر سے لگ بھگ اقبال کا رنگ جھلکتا ہے۔“

”قطعہ نگاری میں ان کو بیڑی طوطی حاصل ہے اس صنف میں علامہ اقبالؒ سے

بے حد متاثر ہیں۔۔۔۔۔ انہوں نے اپنے قطعات میں تجربات کی ایک فکر

انگیر دنیا بسالی ہے۔ ان کے قطعات ان کے شعور عصر کے نمازیں ان میں

جذبات کا ارتعاش بھی ہے مشاہدے کی رنگینی بھی اور فکر کی گہرائی بھی۔“ ۲

اقبالؒ کے افکار کا بنیادی سرچشمہ قرآن اور حبیب خدا کی ذات بابرکت ہے۔ عشقِ رسولؐ ان کے یہاں سرمایہ حیات ہے۔ نازکی نے بھی اقبالؒ کی طرح عشقِ رسولؐ کو ہی بنیادی موضوع بنایا۔ ان کے کلام کا بیشتر حصہ نعتِ رسولؐ پر مشتمل ہے۔ ان کی نعتوں میں اقبالؒ کے رنگ کے ساتھ ساتھ حضرت محمدؐ کے تئیں انہیں کے عیسوا والہانہ عشق کا جذبہ بھی موجود ہے۔ وہ اقبالؒ کی نعتوں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”اُردو زبان میں بڑے بڑے نعت گو شعراء پیدا ہوئے ہیں۔ ان

میں مولانا ظفر علی خان، حفیظ جالندھری، ہری چند اختر وغیرہ نے بعض ایسی

نعتیں لکھیں جن کو بقائے دوام حاصل ہوا اور متاخرین میں عاشقِ رسولؐ اقبالؒ

سب پر بازی لے گئے۔“ ۳

نازکی نے بھی اقبالؒ ہی کی طرح نعتِ رسولؐ لکھنے کی کوشش کی ہے۔ ذیل میں چند اشعار نمونہ پیش کئے جاتے ہیں۔

گم میں آفاق ذات میں جس کی

علم جس کا ہے بحر و بر پے محیط

نازکی

عالم آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ

ذره ریگ کو دیا تو نے طلوع آفتاب

اقبالؒ

نازکی کے یہاں عشقِ رسولؐ کے ساتھ ساتھ وہاں کی سرزمین سے محبت ہی نہیں بلکہ گہری عقیدت رہی ہے۔ ان کے اکثر اشعار میں مدینہ کا ذکر ملتا ہے۔ اقبالؒ نے مدینے شہر کو دنیا کے تمام مراکز سے عظیم اور شاندار کہا ہے۔ شرب کا اکثر استعمال اقبالؒ کے اشعار میں بھی ملتا ہے جیسے:

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانش فرہنگ

سرمہ ہے مری آنکھ کا خاک مدینہ و نجف

اقبالؒ

لوگ کہتے ہیں جنت کشمیر

حسن کے تاج کا نگینہ ہے

یہ مرے جسم کا وطن ہے مگر

میرے دل کا وطن مدینہ ہے

نازکی

نازکی اقبالؒ کی طرح عشق کو عقل پر ترجیح دیتے ہیں۔ عشق ہی زندگی ہے اور عشق سے ہی زندگی کے تمام مراحل طے ہو سکتے ہیں۔

عشق والوں سے نہیں، نام کے دیوانوں سے

کھا گئے اہل خرد مات، خدا خیر کرے

نازکی

میر غلام رسولؐ نازکی کے یہاں اور بھی موضوع ہیں جن پر اقبالؒ کے اثرات صاف دکھائی دیتے ہیں۔ جیسے عقل و عشق، حرکت و عمل، دور حاضر کی صورتحال، زوال معاشرہ، خودی وغیرہ شامل ہیں۔ اقبالؒ کی نظم میں انسان ایک عظیم ہستی ہے۔ وہ اشرف المخلوقات ہے۔ عظمت انسان اقبالؒ کی شاعری کے بنیادی موضوعات میں شمار ہے۔ نازکی بھی اقبالؒ کی طرح عظمتِ آدم کے ہی گیت

گاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کچھ اشعار پیش کئے جاتے ہیں جن سے یہ اندازہ ہوگا کہ کس کس موضوع کو نازکی نے اقبالؒ سے لے کر کے اپنا بنانے کی کوشش کی ہے۔

عروج آدم غاکی سے انجم سہ جاتے ہیں

کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

اقبالؒ

یا الہی ہوتا مرے آسماں والوں کی خیر

آدم غاکی نہیں ہے اب مہ کامل سے دور

نازکی

نازکی بھی اقبالؒ کی طرح حرکت و عمل کی تلقین کرتے ہیں کیونکہ اسی سے انسان اپنی تقدیر بدل سکتا ہے۔ اسی سے زندگی کی مشکل راہیں آسان ہو سکتی ہیں۔ اقبالؒ کی طرح نازکی نے وطنی تصور انہی معنوں میں لیا ہے۔ جن میں اقبالؒ نے لیا ہے۔

درویش خداست نہ شرقی ہے نہ غربی

گھر میرا نہ دلی نہ صفا ہاں نہ سمرقند

ہمسایہ جبریل امین بندۂ غاکی

ہے اس کا نشین نہ سمرقند نہ بخارا

نازکی نے اقبالؒ کی طرح ڈرامائی اور مکالماتی انداز بیان کو بھی اپنی شاعری کا زیور بنایا۔ یہ مکالماتی انداز بیان اقبالؒ کے قطعات اور نظموں کا بھی نمایاں وصف ہے۔

جو یورپ سے لگا سورج ابھرنے

کہا شبنم کے قطرے سے گہرنے

نہ تھی تجھ میں حلاوت موتیوں کی

فنا انجام کو آیا تھا مرنے

نازکی

ہر لحظہ نیا طور، نئی برق تجلی

اللہ کرے تجھ کو عطا دیدۂ بینا

اس شعر سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ نازکی نے اقبالؒ کی طرح تراکیب، استعارات، تلمیحات، اسلوب بیان کو برتنے کی بہترین کوشش کی ہے۔ دونوں کے کلام میں انتہائی درجے کی موسیقی ہے۔ حامدی کشمیری لکھتے ہیں:

”ان کے یہاں اقبالؒ کے فکر و فن اور پیغام کا اثر نمایاں ہے۔“ ۴

میر غلام رسولؐ نازکی کی شاعری سے اندازہ ہوتا ہے کہ اردو و فارسی شعری روایت کی نفاست اور رنگارنگی کافی حد تک ان کے خیال میں جذب ہو چکی ہے۔ فارسی الفاظ و تراکیب سے ان کا شغف نمایاں ہے لیکن دیگر الفاظ سے بھی انہوں نے اپنی شاعری میں جو کام کیا ہے، وہ جہاں ان کی قادر الکلامی کے ثبوت فراہم کرتا ہے وہیں لفظوں کو برتنے کا صحیح سلیقہ بھی رکھتے ہیں۔ نازکی کے کلام پر اقبالؒ کا اتنا زیادہ اثر ہے کہ ان کی شاعری کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جہاں اقبالؒ کا اثر نمایاں نہ ہو۔ نازکی کے ہر شعر سے لگ بھگ اقبالؒ کا رنگ جھلکتا ہے۔

حوالہ:

۱۔ اسد اللہ اونی، اقبالؒ اور جموں و کشمیر کا اردو ادب، (غیر مطبوعہ مقالہ، ۱۹۵۵ء)، ج۔ ۱، ص۔ ۱۹۶

۲۔ پروفیسر حامد یحیٰ کشمیری، ریاست جموں و کشمیر میں اردو ادب، (سرنگر: گلشن پبلیشرز، ۱۹۹۱ء)، ج۔ ۱، ص۔ ۱۲۰

۳۔ میر غلام نازکی، چراغِ راہ، دیباچہ ص: ۱۰-۱۱

۴۔ پروفیسر حامد یحیٰ کشمیری، ریاست جموں و کشمیر میں اردو ادب، (سرنگر: گلشن پبلیشرز، ۱۹۹۱ء)، ص۔ ۷۵

□□□

ڈاکٹر ناظم حسین
شعبہ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
9335336222



فارسی زبان و ادب اور راجہ رتن سنگھ زخمی

آج دنیا کے اندر میگزینوں کی زبانیں بولی اور پڑھی جاتی ہیں۔ کچھ زبانیں قدیم ہیں تو کچھ زبانیں قدیم و جدید تہذیب سے وجود میں آئیں مگر وہ زبانیں جو ایک قدیم زمانے سے بولی جا رہی ہیں۔ اس میں ایک فارسی زبان بھی ہے، گو کہ یہ زبان جو کم و بیش موجودہ شکل میں موجود ہے اس کا وجود اگرچہ تیسری صدی ہجری سے ملتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ فارسی زبان اور آریائی زبان ہے۔ اس کی تاریخ اس وقت سے ملتی ہے جس وقت سے سرزمین ایران۔ پڑاؤیوں کے آمد کا سلسلہ شروع ہوا، مورخین کا خیال ہے کہ ایران میں آریوں کا داخلہ کا آغاز آج سے تقریباً تین سو سال قبل ہو چکا تھا، مگر زمانہ کے ساتھ تہذیبیں بدلتی رہیں اور اس کا اثر اس زبان پر بھی پڑا۔ موجودہ دور میں جو فارسی زبان موجود ہے اس کا وجود تیسری صدی ہجری میں ملتا ہے، ایران جب عربوں کے زیر اقتدار آیا گیا تو اس وقت وہاں عربی زبان کا اثر شروع ہوا پھر بھی فارسی ایران میں فروغ پاتی رہی۔

جب فارسی زبان و ادب کا دائرہ وسیع ہوا تو یہ زبان ایرانی سرحد کو عبور کر کے ہندوستان کی سرحد میں بھی داخل ہو گئی، اور پھر آگے چل کر قرون وسطیٰ میں فارسی زبان ہندوستان کی سرکاری زبان کی حیثیت سے رائج ہو گئی، اور اہل علم و فضل نے اس زبان کو اپنے افکار و نظریات کے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے سرکاری دفاتر کے سارے کام اسی زبان میں انجام دے جانے لگے۔ مغلیہ عہد فارسی زبان کا سب سے تابناک عہد کہا جاتا ہے۔ اس عہد کے حکمران خود صاحب فضل و کمال تھے اس لئے وہ صاحبان علم و فضل کے قدر دان بھی تھے، ان کی ذرہ نوازیوں نے ایران کے شعرا کو ہندوستان کی جانب متوجہ کیا اور ان کے آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہوا، ایرانی فنکاروں ادیبوں اور شاعروں کی آمد سے ہندوستان کی تہذیب و فن پر بڑا گہرا اثر پڑا، اس وقت ہندوستان میں بھی ایک سے بڑھ کر ایک صاحب فضل و کمال ادیب و شاعر موجود تھے جن کی قابلیت کا مکہ صرف ہندوستان ہی سے نہیں، بلکہ ایران میں بھی چل رہا تھا، اور اہل ایران نے ان کی قابلیت کو نہ صرف قبول کیا بلکہ انہیں جائز مقام بھی عطا کیا۔ مسلم حکمرانوں کے ذریعہ فارسی زبان و ادب کی قدر دان کی کو دیکھ کر غیر مسلموں میں بھی اس زبان کو سیکھنے کا شوق پیدا ہوا جس کی وجہ سے انہیں حکومت میں مناصب بھی ملے، اس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کے فارسی زبان و ادب سے دلچسپی سے یہ زبان سرزمین ہند میں خوب فروغ پائی، ہندوؤں میں کانتھہ برادری کے لوگ اس زبان کو سیکھنے میں پیش پیش رہے۔

صوبہ اودھ کا مختصر تعارف:

جب مغل حکمران اکبر تخت نشین ہوا تو اس نے ملک میں ایک نئی فضاء قائم کرنے کے لئے تقریباً تمام شعبہ جات میں تبدیلیاں کیں، اس میں سب سے اہم تبدیلی تھی کہ اس نے جاگیردارانہ نظام کو ختم کر دیا اور پورے ملک کو بارہ صوبوں میں تقسیم کیا انہیں صوبوں میں ایک اہم صوبہ اودھ کا بھی تھا، اودھ کے حدود اربعہ کے بارے میں ڈاکٹر اشروادی لال شریو استویوں رقم طراز ہیں۔

”شمال میں ہمالیہ کی پوربی چوٹیاں، شرق میں بہار، جنوب میں (صوبہ الہ آباد) ماننک پور تک، اور مغرب

میں قنوج تک گوکھپور کے مشرقی حصہ سے قنوج تک تقریباً دو چالیس میل لمبائی اور شمالی پہاڑی سے لے کر

ماننک پور ریاست کے شمالی حدود تک دو تیس میل چوڑائی تھی، ان سب کا قبضہ ایک لاکھ اکتھتر ہزار اسی تیرہ تھا۔“

داخلی انتشار اور خارجی حملوں، اندرونی بغاوتوں کی بنیاد پر جب دہلی میں مغلوں کا دبدبہ کم ہونے لگا، اور سلطنت مغلیہ کمزور ہو گئی تو بادشاہ محمد شاہ کے زمانے میں حکومت کا بچا کچھ دبدبہ بھی دم توڑ دیا تو پورے ملک میں افراتفری کا ماحول پیدا ہو گیا اور جگہ جگہ نیم خود مختار حکومتیں قائم ہونے لگیں۔ نظام الملک اور علی دری خان جیسے لوگوں نے اپنی الگ الگ حکومتیں قائم کر لیں اور نواب بن گئے، اسی زمانے میں

”دہلی میں جب مغلوں کی حکومت چراغ سوئی کی طرح ٹٹمانے لگی اور اس کی مرکزیت نے دم توڑ دیا، تو اس کا اثر فارسی زبان و ادب پر بھی پڑا مگر خود مختار قائم ہونے والی مختلف حکومتوں نے اس کی طرف بھرپور توجہ دی، اودھ کے حکمرانوں نے اور یہاں کے باشندوں نے فارسی زبان کی ترویج و اشاعت میں اہم کردار ادا کیا۔ چونکہ اس ریاست کے حکمران فارسی زبان و ادب کے عاشق زار تھے، اس لئے ان لوگوں نے اس زبان کے فروغ میں بھرپور حصہ لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مختصر سی مدت میں لکھنؤ فارسی زبان و ادب کا مرکز بن کر سامنے آیا۔ سرزمین اودھ کا ایک نایاب ہیرہ راجہ رتن سنگھ زخمی اودھ کے نوابوں کی فارسی زبان و ادب سے دلچسپی نے یہاں کے علمی و ادبی فضا کو اس قدر خوشگوار بنا دیا کہ بلا تفریق مذہب و ملت لوگ فارسی زبان کو سیکھنے لگے، خاص کر ہندوؤں نے اس میں اتنی دلچسپی دکھائی کہ ان میں بہت سارے لوگ صاحب دیوان شاعر بہترین نثر نگار کالم نویس اور تذکرہ نگار پیدا ہوئے۔“

میر محمد امین کو ۹ ستمبر (۱۷۲۲ء) کو اودھ کا صوبہ دار مقرر کیا گیا، اور فیض آباد کو اودھ کی راجدھانی بنایا گیا، اودھ کے اس صوبے پر نوابوں کا کل دور تقریباً ۱۱۳ سال کا رہا۔ اس کے پہلے نواب میر محمد امین سعادت علی خان برہان الملک رہے، جبکہ آخری نواب نواب واجد علی شاہ رہے، جنھیں ۱۸۵۶ء میں انگریزوں نے حکومت سے بے دخل کر دیا اس طرح ۱۱۳ سال نوابین کے عہد کا خاتمہ ہو گیا۔

سرزمین اودھ پر فارسی زبان و ادب کا فروغ:

دہلی میں جب مغلوں کی حکومت چراغ سوئی کی طرح ٹٹمانے لگی اور اس کی مرکزیت نے دم توڑ دیا تو اس کا اثر فارسی زبان و ادب پر بھی پڑا مگر خود مختار قائم ہونے والی مختلف حکومتوں اس کی طرف بھرپور توجہ دی، اودھ کے حکمرانوں نے اور یہاں کے باشندوں نے فارسی زبان کی ترویج و اشاعت میں اہم کردار ادا کیا۔ چونکہ اس ریاست کے حکمران فارسی زبان و ادب کے عاشق و زار تھے، اس لئے ان لوگوں نے اس زبان کے فروغ میں بھرپور حصہ لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مختصر سی مدت میں لکھنؤ فارسی زبان و ادب کا مرکز بن کر سامنے آیا۔ سرزمین اودھ کا ایک نایاب ہیرہ راجہ رتن سنگھ زنجی اودھ کے نوابوں کی فارسی زبان و ادب سے دلچسپی نے یہاں کے علمی و ادبی فضا کو اس قدر خوشگوار بنا دیا کہ بلا تفریق مذہب و ملت لوگ فارسی زبان کو سیکھنے لگے، خاص کر ہندوؤں نے اس میں اتنی دلچسپی دکھائی کہ ان میں بہت سارے لوگ صاحب دیوان شاعر بہترین نثر نگار مافیہ و افسر تہذیب نگار پیدا ہوئے اور ان کی علمی قابلیت کی بنیاد پر انھیں حکومتی عہدے بھی سپرد کئے گئے، انہیں علمی شخصیات میں سے ایک ذات راجد رتن سنگھ زنجی کی ہے۔

آپ ایک قادر الکلام شاعر صاحب طرز ادیب مکتبہ شاس شارح، سند اور معتبر تہذیب نویس اور علم نجوم کے ماہر تھے، آپ ہندی اردو کے علاوہ عربی فارسی ترکی، سنسکرت اور قدرے انگریزی زبان بھی جانتے تھے۔

جائے پیدائش اور خاندانی پس منظر:

راجد رتن سنگھ زنجی کی پیدائش لکھنؤ کی سرزمین پر ہوئی، آپ ۲۳ محرم ۱۱۹۷ھ مطابق ۹ ستمبر ۱۷۸۲ء کو یکشنبہ کے دن پیدا ہوئے، آپ کے والد بالک رام نواب آصف الدولہ کے دور میں توپ خانے کے افسر تھے، آپ کے بارے میں فارسی تہذیب نویس کے مصنف یوں رقم طراز ہیں:

” زنجی در لکھنؤ در شب یکشنبہ ۲۳ محرم ۱۱۹۷ھ مطابق در دسامبر ۱۷۸۲ء

میلادی چشم بدینا کشود در آواز شاب شوق اکتساب علم بدش افتاد بنا بر میں بعض زبانہائے مشہور و متداول مانند فارسی عربی و ہندی، سنسکرت، و انگلیسی را بقدر مایحتاج فرا گرفت و بالعلوم عقلیہ و نقلیہ در میں زبانہا آشنا شد“

راجد رتن سنگھ زنجی کے علمی کمالات کا اعتراف کرتے ہوئے سید سلیمان ندوی رسالہ معارف میں یوں تحریر کرتے ہیں:

”منشی الملوک فخر الدولہ، دبیر الملک رتن سنگھ زنجی جائے پیدائش لکھنؤ

قوم کا ستھ اس کا خاندان تین پشتوں سے دربار اودھ میں معزز عہدوں پر

ممتاز تھا، رتن سنگھ بڑا فاضل تھا اور علامہ تھا۔“

راجد رتن سنگھ زنجی کی شاعری:

راجد رتن سنگھ زنجی ایک عظیم فن کار شاعر تھے انہوں نے دیگر زبانوں کے ساتھ فارسی زبان بھی سیکھی، یہ نہ دیکھا کہ اس کے استعمال کرنے والوں کی ذات اور ان کا مذہب کیا ہے، راجد رتن سنگھ نے فارسی کو صرف ایک زبان سمجھ کر سیکھا اور اس پر عبور حاصل کیا، اور نثر و نظم میں بھرپور طبع آزمائی کی آپ اپنے زمانے میں سرزمین اودھ پر شعراء کے درمیان ایک عظیم مقام رکھتے ہیں اس کی وجہ یہ رہی کہ زنجی فارسی زبان کے فطری شاعر تھے شعر و شاعری کا فن آپ کو وراثت میں ملا تھا۔ آپ کی خداداد صلاحیتوں کا اعتراف آپ کے معاصرین نے بھی کیا۔ آپ کو شعر و شاعری پر کس قدر قدرت

حاصل تھی اس کے بارے میں زبیر بہادر سری و استویوں رقم طراز ہیں۔

” راجہ رتن سنگھ زنجی ماہر اور قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کے یہاں شگفتگی روانی دلکشی اور معنی آفرینی کی فراوانی ہے ان کے کلام میں معتدلتین اور ہم عصر اساتذہ کے مضامین کا تورا داکثر پایا جاتا ہے۔“

کہتے ہیں عقلمند وہی ہوتا ہے جو دوسروں کے تجربے سے فائدہ اٹھاتا ہے، وہ راجہ رتن سنگھ زنجی نے بھی اسی حکمت کا مظاہرہ کیا اور اپنے پیش رو شوری کے انداز سے بہت کچھ سیکھا، آپ کے دیوان میں غزل کی کثرت ہے، اسی لئے غزل کی دنیا کے بے تاج بادشاہوں کے خزانوں سے بھرپور استفادہ کیا، وہ پیش رو شعراء ان کی شعری روایتوں سے آپ نے بہت کچھ لیا، ان میں شیخ سعدی، شیرازی، حافظ اور امیر خسرو دہلوی کا نام قابل ذکر ہے۔ مذکورہ بالا شعراء کی غزلوں میں محبوب کے حسن، اس سے عشق و معشوق کی سہ توہی اس کے لئے توپ کا تہذیب آپ کو باجیا ملے گا۔

یہ فارسی غزل کی خصوصیت ہے۔ اس میں معشوق جو ہوتا ہے۔ وہ ظالم فریب حیلہ باز، مکاری، صفا کی بجائے رعبی، بیدردی، بے اعتنائی کا مجموعہ ہوتا ہے، وہ عاشق کے شوخ دل اور بے تابی کو جانتے ہوئے بھی اس پر ایک نگاہ ڈالنا بھی پسند نہیں کرتا، زنجی نے اپنی غزلوں میں اس کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ بطور نمونہ چند شعر ملاحظہ کریں:

ندانم کی بیگانہ یا آشنائی کہ
گہرا آشنائی گاہ نہ آشنائی
بمن عشق گفتمی و شیر بندشمن
گمان برد بودم کہ نا آشنائی
برائے تو از خلق بیگانہ گشتم
تو ہم طرفہ نا آشنا آشنائی
زغم مردہ زنجی ہمیں گفتہ گفتہ
فلانے کجائی فلانے کجائی

اس کے علاوہ زنجی کے اشعار میں نغمگی اور نرم جہت ادا، زبان کی لطافت، الفاظ کی شیرینی، سادگی کے باوجود فصاحت و روانی، تشبیہ و استعارہ کے ساتھ ساتھ جوش بیان بھی پایا جاتا ہے زنجی کی شاعری میں خیالات کی دنیا دیکھنے کے بعد یہ کیا جا سکتا ہے کہ زنجی جذبات کے بھی شاعر ہیں۔ زنجی نے چھوٹے چھوٹے محروں میں بھی شاعری کی اور اس میں وہ بہت کامیاب رہے، چھوٹے محروں سے آپ کی بہت ساری غزلیں ہیں۔ اس کے علاوہ آپ نے رباعیات بھی لکھیں اور منتخبیں بھی لکھیں جس کو پڑھنے کے بعد قاری یہ کہہ اٹھتا ہے کہ حقیقت میں راجد رتن سنگھ زنجی ایک قادر الکلام شاعر تھے۔

راجد رتن سنگھ زنجی کی فارسی نثر نگاری:

راجد رتن سنگھ زنجی صرف ایک شاعر نہیں تھے، بلکہ اپنے زمانے کے ایک عظیم نثر نگار ادیب بھی تھے، آپ نے جہاں شعر و شاعری کے ذریعے فارسی زبان و ادب کی خدمت کی وہیں نثر نگاری میں بھی اپنے عہد میں آپ اپنی مثال آپ رہے۔

حواشی:

- ۱- دی فرسٹ نوابس آف اودھ ص ۳۱، ۳۲ اور ۹۳؛ اکثر اخیر وادی لال سری یو استو
- ۲- تذکرہ نویس فارسی در ہند و پاکستان بقوی علی رضا سید، صفحہ ۵۲۶، ۵۳۱
- ۳- معارف نمبر ۲ جلد ۳ صفحہ ۶۳، ۶۴ جولائی ۱۹۱۸ء، رمضان ۱۳۳۶ھ
- ۴- تذکرہ نویس در ہند و پاکستان ج ۱ صفحہ ۵۲۶، ۵۲۷ سید علی رضا نقوی
- ۵- دیوان زنجی ص ۹۲ مطبع محمد لکھنؤ، ۱۳۷۳ھ

□□□

غزل

میں اک پرندہ قیدِ زمان و مکان کا
کرنا ہے تجربہ مجھے اپنی اڑان کا
خلقت سے اپنی ویسے تو میں مشتِ خاک ہوں
نسبت سے تیری فخر ہوں اس آسمان کا
میں صورتِ ہدف میں رہا زد پہ تیر کی
اور فصل برقرار تھا تیر و کمان کا
تارِ حیات سے بھی ہے نزدیک مجھ سے وہ
اطلاق اس پہ ہوتا ہے پھر لامکان کا
وہ اپنے گھر بلا کے دیا ہے فریبِ نو
کیسے ادا کرونگا میں حقِ میزبان کا
وہ مجھ میں میری طرح سے تحلیل ہو گیا
باقی رہا نہ فرق کوئی درمیان کا
وہ میری ترجمانی کے ذوقِ سخن میں تھا
کھو بیٹھا اعتبار بھی لفظ و بیان کا
میں نا خدائے قلم طوفانِ زندگی
کشتی کا خوف ہے نہ مجھے بادبان کا
میرِ سخن ہوں غالبِ مضمونِ غیب ہوں
شاعر ہوں ہر صدی میں، میں اُردو زبان کا
حد ہو گئی فرازِ تری سرفرازیوں
سر کر گئیں ہیں معرکہ تیغ و سنان کا

فرازِ رضوی

حیدرآباد

9959572516

غزل

لپٹے ملیں گے سب کے بدن چھائیں میں
اک روز دفن ہونا ہے کچی زمین میں

باطل سے حق ہمیشہ نبرد آزما رہا
یہ کشمکش ازل سے رہی کفر و دین میں

ایذا سے قبل آپ انہیں مار دیجئے
نفرت کے سانپ پالے ہیں جو آستین میں

یہ عہد کرنا چاہتے ہر عقل مند کو
حاصل کریں گے علم ملے خواہ پین میں

کرنے لگے پسندِ ترم بجائے شعر
کتنا زوال آگیا ان شائقین میں

ناقدِ رئی سخن نے یہ دن بھی دکھائے
بیٹھے ہوئے ہیں ہم بھی صفتِ سامعین میں

مخمور اس کو نارِ جہنم جلائے گی
داغل ہوا ہے حلقہ صد مرتدین میں

مخمور کا کوری

چودھری محلہ، کاکوری لکھنؤ

9450097929

غزل

نہ جانے کیوں وہ مجھ سے بدگماں ہے
بڑا دل سوز میرا امتحان ہے

بس اس کی یاد میں دن کٹ رہے ہیں
بتا اے آسمان تو، وہ کہاں ہے

سبھی سے نہیں کے ملتا ہے برابر
سوا میرے ہر اک پر مہرباں ہے

نہ میکش ہیں نہ ساقی اور نہ ساغر
یہ میخانہ ہے یا اجڑا مکاں ہے

یہ ایسا دور ہے اہل زباں کا
نہ کوئی چاہنے والا نہ کوئی قدرداں ہے

تجھے دل میں بسایا جب سے ہم نے
ہوا دشمن ہمارا آسمان ہے

بیاں کیسے کروں احوال اپنا
غموں سے پر ہماری داتاں ہے

حمایتِ موسم گل کا تصور کر کے دیکھا
لگا ایسے کہ جیسے وہ یہاں ہے

ڈاکٹر حمایت جالسی

۵۳۵/۲، سیکڑا میچ، کرسی روڈ جانی پورم، لکھنؤ

9415394457

غزل

ظلم کی اُس نے انتہا کر دی
ناروا بات بھی روا کر دی

کاٹ دی ہے زبان تالو سے
حق کی آواز بے صدا کر دی

دل میں پوشیدہ کچھ نہیں رکھا
میں نے ہر بات آئینہ کر دی

کیسی نادانی ہو گئی مجھ سے
میں نے پتھر سے التجا کر دی

کی محبت کی میں نے جو تبلیغ
اُس نے نفرت کی ابتدا کر دی

بند اُس نے دعا سلام کیا
میں نے ایسی بھی کیا خطا کر دی

جو تھا آمادہ دشمنی پہ مری
میں نے اُس کے لئے دعا کر دی

رب کی مرضی پہ جو چلا ہے ظفر
اس کی آسودگی عطا کر دی

ظفر اقبال ظفر

۱۷۰، خیلدار، فتح پور (یوپی)

7979512431

غزل

فضاؤں میں دھواں کب تک رہے گا
سلگتا ہر مکاں کب تک رہے گا

یہاں ہے ہر طرف دلدل ہی دلدل
یہ آخر امتحاں کب تک رہے گا

سکوں اک پل کو بھی ملتا نہیں ہے
دل اتنا بیقرار کب تک رہے گا

درختوں کا کوئی سایہ نہیں ہے
پر تپتا سائبان کب تک رہے گا

مری بستی سے شعلے اٹھ رہے ہیں
یہاں کا رزیاں کب تک رہے گا

بہت مجبور ہیں بستی کے رہبر
یہ دست تنگ داں کب تک رہے گا

سکوں کا شاذیہ ہر لمحہ نہیں ہے
یہ دل آتش فشاں کب تک رہے گا

شاذیہ خان

لکشمی داس بلڈنگ، نشاط گنج، لکھنؤ

8887984564

غزل

شکستہ رشتہ ہوا ہے تو آن بان کہاں
کھلی فضا میں ہوں تو سر پہ سائبان کہاں

بھنور کے ساتھ ہی رہتا ہے مشغلہ اس کا
شکستہ کشتی کیے حصے میں بادبان کہاں

ہمارے سینے میں اترے ہیں نفرتوں کے سبق
ہمارے لب پہ محبت کی داستان کہاں

ہر ایک شخص ہی ٹوٹا ہوا ہے اندر سے
غموں کو بانٹنے والا پریش مہمان کہاں

مہک اٹھا تھا جو اس کی وفا کی خوشبو سے
وہ پُر بہار محبت کا اب مکان کہاں

جوا اپنے آپ ہی رکھتا ہو آئینے کی صفت
اب ایسا شخص سراج مرے درمیان کہاں

سراج سیکینہ

سنگم اسکول بلڈنگ، ڈالی گنج، پورٹ بلیئر

9679567384

اشفاق برادر

مکان نمبر ۱۵/۱۳۲، بابو پوروہ کانپور

7499646978



افسانہ

مجھے یقین ہے کہ۔۔۔۔۔

دیکھو میری جانب اور بات سنو۔۔۔۔۔

میں اس وقت تمہاری کوئی بھی بات نہیں سنوں گا۔۔۔۔۔ کیوں؟۔۔۔۔۔ کیوں کا بھی جواب نہیں دوں گا؟۔۔۔۔۔ تمہاری یہ حرکت مجھے بالکل پرند نہیں۔۔۔۔۔

نہ ہو۔۔۔۔۔ کیا میں اپنے بال نوچنے لگوں۔۔۔۔۔ بھلا تمہاری مرضی میں، دُٹ کیوں دوں؟۔۔۔۔۔ جہنم میں جاؤ۔ یہ کہتے ہوئے بیگم سلی کمرے سے باہر ہو گئیں۔۔۔۔۔

میں جان چکا تھا کہ سلی کی بھابھی سے موبائل پر کیا باتیں ہوئی تھیں۔ مجھے دہلی نہیں جانا تھا کیونکہ میرا ہاتھ اس وقت بہت تنگ تھا پچھلے ماہ ہی ہم سبھی دہلی شادی میں گئے تھے۔ سب کے ننے۔ ننے کپڑے بنے تھے، دس جوڑے کپڑے دینے کے واسطے لیے گئے، آنے جانے کا ریزرویشن ٹکٹ، خرچ کے لیے الگ پیسے، ایک نوکری پیشہ کے لئے بڑا بوہڑ تھا۔ جس شعبے میں تھا وہاں رشوت، گفٹ نہیں تھا سو کھی تنخواہی اس پر دو بچوں کی پڑھائی کا خرچ یعنی قبر کا مال مردہ ہی جانے، اس پر بیگم سلی کی فرمائش۔ بس اب، بہت ہو گیا اب کچھ نہیں۔

بھابھی نے کل رات پھر مجھے کال کیا۔ جی بھابھی، سلی سے کیوں بات بند کر رکھی ہے، بھابھی۔ میں تو بات کر رہا ہوں وہی نہیں مخاطب ہوتی، کوئی مار پیٹ۔۔۔۔۔ نہیں، بالکل نہیں، اس زمانے میں بیوی سے کون مار پیٹ کرے گا، بنا بات کے ہی بات نکالتی ہے سلی۔۔۔۔۔ پھر بول پال کیوں نہیں ہے۔ اب کیا بتاؤں بھابھی ابھی پچھلے مہینے تو ہی دہلی شادی میں ہم سبھی آئے تھے اچھا خاصہ خرچ ہوا۔ اس وقت ہاتھ تنگ ہے اور سلی کہہ رہی ہے دوسروں کو دیکھتی ہے اپنے کو نہیں۔ اور بھابھی بول رہی تھیں۔ جاوید میاں۔ رشتہ داری نبھائی۔۔۔۔۔ سلی میں سو بوجھ بوجھ کی کمی ہے دوسروں کو دیکھتی ہے اپنے کو نہیں۔ اور بھابھی بول رہی تھیں۔ جاوید میاں۔ رشتہ داری نبھائی جاتی ہے پھر بہن۔ بہن کا معاملہ ہے، یہ کوئی بتانے کی بات تھوڑی ہے یہ کہہ کر بھابھی نے موبائل کال کاٹ دی اور میں سر تھام کر بیٹھ گیا۔۔۔۔۔ باتیں میرے ذہن میں گونج رہی تھیں اب عزیز واقارب میں شرارت بھرے لب و لہجے کو فروغ دیا جائے گا۔ معاملات تو کوئی سمجھے گا نہیں جھٹکت باتیں، ایک ذرا سی بیوقوفی میں زمین پر جھاڑ بھنکاڑ۔۔۔۔۔ اب کیا کروں؟

صبح ہی میں اپنے دوست ہاشم کے پاس پہنچا۔ میری شکل دیکھ کر ہی ہاشم ہنسنے لگا۔ اے، چہرہ کیوں بگڑا ہوا ہے، کیا بتاؤں یا؟۔ عورت اور رشتہ داروں سے پریشان ہوں۔ کوئی نئی بات بتاؤ تو سبھی کے ساتھ لگا رہتا ہے، خود کو ہلاکت میں کیوں ڈال رہا ہے، زہر پینے سے ڈرمت۔ راستہ نکال، راستہ، سب درست ہو جائے گا۔۔۔۔۔ بول کیا بات ہے؟ یا۔۔۔۔۔ سلی کو دہلی اس کی بہن منیرہ کے پاس بھیجنا ہے مجھے دس ہزار کی سخت ضرورت ہے۔ روپیہ تو یہ لے مگر بے جانت خرچ کر، تو تو سلی کے مزاج کو جانتا ہے۔ ہوں۔ ایک لمبی سی سانس باہر چھوڑی۔ جاوید تو میرا یار ہے بچپن کا دوست ہے سلی کو پیار سے سمجھا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ناشتہ کر لے پھر جانا۔ یونہی نہار منہ گھر سے نکلا ہو گا۔ نہیں ہاشم، مجھے جانے دے، بیٹھ۔ بیٹھ۔ روٹی ناشتہ لے آؤ جاوید کیلئے۔۔۔۔۔

سلی۔ یہ لو دس ہزار جو ہاشم سے مانگ کر لایا ہوں اور یہ دو ہزار میرے پاس ہیں تیاری کرو دہلی جانے کی۔ یہ کہہ کر جاوید نے اپنا بیگ سنبھالا اور آتش کے لئے نکل گیا۔ سلی نے نفٹ بھی نہیں تیار کیا تھا۔ جاوید آتش تو پہنچ گیا لیکن اس کا دل و دماغ کام میں لگ نہیں رہا تھا۔ لچ ناٹم میں چہرہ اسی سے اس نے ٹیٹن سے کھانا منگو کر کھایا۔ بغل والی سیٹ پر بیٹھے شرمابی کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں مگر جاوید کے خیالات خود شور مچا رہے تھے۔

”پہلے بچے کی پیدائش پر میں نے سلی سے کہا کہ منیرہ کو بلوا لو بچہ ہاسپٹل میں ہو جائے گا۔ آسانی اور کم خرچے میں کام ہو جائے گا۔ جان پہچان اور بھروسے کا ڈاکٹر ہے بات بھی کر رکھی ہے لیکن منیرہ کے آتے ہی زنگ ہوم کی بات ہونے لگی، میں کیا کہتا بہن نے زنگ ہوم میں زچگی کی بات سمجھا دی اور پھر زنگ ہوم میں آپریشن سے بچہ پیدا ہوا۔ ستر ہزار کا بل بنا۔ میرے تو بیروں تلے زمین نکل گئی ادھر ادھر کر کے بل ادا کیا گیا۔ بہر حال کافی دقتوں کے بعد حالات پٹری پر آئے پھر دوسرے بچے میں تیس کے قریب خرچ ہوا مجھے کچھ سکون ہوا۔ میری ساس نے کافی میوہ اور صلہ بواڈالا۔ میں کہتا رہا یہ بہت زیادہ ہے، میری ساس کا کہنا تھا کہ ناطے رشتے داروں اور پاس پڑوس میں بھی بھجواؤ گے یا نہیں، لوگوں کو بھی تو معلوم ہونا چاہئے کہ ہم بھی سماج میں حیثیت رکھتے ہیں۔ کل ملا کر میری جیب خالی ہی نہیں مقروض ہو گئی۔ سلی نے ان معاملات پر ایک لفظ بھی نہیں بولا بلکہ اپنی ماں کی ہاں میں ہاں ہی ملاتی رہی۔“

غزل

جیسے جسموں کو چٹائیں کھا گئیں
زندگی کو یوں بلائیں کھا گئیں
کھا گیا انساں گچھاؤں کا وجود
اور تمدن کو گچھائیں کھا گئیں
گزرا بچپن جس کے سائے میں مرا
وہ شجر بوڑھی ہوائیں کھا گئیں
پاؤں میں اب آبلے پڑتے نہیں
ریگ صحرا کو گھٹائیں کھا گئیں
بھوک اور افلاس نے وہ دن دکھائے
اپنے ہی بچوں کو مائیں کھا گئیں
ابن یعقوب آئے گا اک دن ضرور
بالیاں گیہوں کی گائیں کھا گئیں
کیا ستم ہے خود مری ہی ذات کو
گنبد جاں کی صدائیں کھا گئیں
روح! عصیاں کی غلاط میں ہے فرق
جسم! ریشم کی قبتائیں کھا گئیں
کیسے نجی وہ کرے گا دوستی
جس کو یاروں کی وفا میں کھا گئیں

عرفان نجمی

کرنیل گج، کانڈی محال، کانپور

8957550267

جاوید کے ذہن میں پرانی ہواؤں کا زور تھا۔ شادی سے پہلے جاوید کی زندگی میں کوئی خاص لچل، کوئی رنگ نہیں تھا۔ سیدھا سادہ انداز تھا۔ ہاں جاوید میں نفاست بہت تھی۔ ماں اکثر کہا کرتی تھی۔ جاوید بیٹا، دنیا داری کی طرف بھی دھیان دیا کرو۔ سب کچھ ایک سا کبھی کسی کے ساتھ رہا نہیں ہے۔ خزاں کے ساتھ بہا رہے اور بہار کے ساتھ خزاں بنی رہتی ہے۔ بیٹا، ہم نے غریبی کے ساتھ تم کو تعلیم دلوائی ہے تمہارا ہر قدم منزل کی جانب بڑھتا رہے، میری یہ دعا ہے۔

جاوید نے نوکری پائی، ہزاروں افراد کو پچھاڑ کر کنکیشن سے آیا، ماں کی دعائیں، آسمان والے کی عنایت جاوید کے ساتھ۔ سلی ایک دور کے رشتے میں کزن تھی اور ماں کے سامنے ہی جاوید کی سلی ہو گئی، جاوید بہت خوش ہوا سلی کو دیکھ کر، ماں تو سب سے زیادہ جیسے اس کی دلی مراد پوری ہو گئی ہو۔ ماں چند لمحوں کے بعد ہی اس سفر پر چلی گئی جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا ہے۔ ماں کی کمی جاوید کو ہر پہل یاد آتی اور اکثر سلی سے اس بات کو لے کر تکرار ہوتی رہتی کہ ہر وقت ماں۔ ماں کو یاد کیوں کرتے رہتے ہو جو بھی دنیا میں آیا ہے اس کو بہر حال ایک وقت کے بعد جانا ہی ہے، جاوید کہتا کہ میری ماں ہے، میں نہیں یاد کروں گا تو کوئی یاد کرے گا، تم تو کرنا نہیں۔ بس تکرار شروع ہو جاتی۔ ہفتہ دس دن زندگی جہنم بنی رہتی۔ ہاشم یا پھر روٹی بھائی جہنم کر، پچکار کر بول چال شروع کروا ہی دیتی تھیں۔

سلی، ہر وقت اپنی تعریف کی بھوکی رہتی۔ اچھائی بتا کر یوں بھی لوگ اپنا کام بننے کو ہنرمندی کہتے ہیں، لباس، چوڑی، پہچل، پرفیوم، میک اپ دوسرے کا ہی اچھا لگتا ہے، سلی تلک کو۔ میں لاکھ بتاؤں سمجھاؤں مگر بے یقینی کے بادل چھائے ہی رہتے، میں بھی کچھ نہیں کہتا مگر جب تھک جاتا تو برسات کی طرح معاملہ ہو جاتا..... سلی میں ایک بات کی خوبی تو ہے کہ وہ زیورات کے بارے میں کوئی فرمائش نہیں کرتی کبھی کبھی سنار کے یہاں جا کر زیورات کے ڈیزائنوں میں اٹل پھیر کر آتی تھی جب مجھ سے بات کرتی تو میں کہہ اٹھتا ایک دن سارے زیورات خراب ہو جائیں گے۔ کیونکہ سنار جو بھی زیور بناتا ہے اس میں نا انکسور لگاتا ہے۔ اور سلی کو چاہے جتنا سمجھاؤ اس کو کرنا اپنی ہی ہے۔

پہلے بچے کی پیدائش پر میں نے سلی سے کہا کہ منیرہ کو بلوا لو بچہ ہاسپٹل میں ہو جائے گا۔ آسانی اور کم خرچے میں کام ہو جائے گا۔ جان بچان اور بھروسے کا ڈاکٹر ہے بات بھی کر کھی ہے لیکن منیرہ کے آتے ہی زنگ ہوم کی بات ہونے لگی، میں کیا کہتا بہن نے زنگ ہوم میں زچگی کی بات سمجھا دی اور پھر زنگ ہوم میں آپریشن سے بچہ پیدا ہوا۔ ستر ہزار کا بل بنا۔ میرے تو بیروں تلے زمین نکل گئی ادھر ادھر کر کے بل ادا کیا گیا۔ بہر حال کافی دنوں کے بعد حالات پھری پڑے پر آئے پھر دوسرے بچے میں تیس کے قریب خرچ ہوا مجھے کچھ سکون ہوا۔ میری ساس نے کافی میوہ اور صلہ بنا ڈالا۔ میں کہتا رہا یہ بہت زیادہ ہے، میری ساس کا کہنا تھا کہ ناطے رشتے داروں اور پاس پڑوس میں بھی بھجواؤ گے یا نہیں، لوگوں کو بھی تو معلوم ہونا چاہئے کہ ہم بھی سماج میں حیثیت رکھتے ہیں۔ کل ملا کر میری جیب خالی ہی نہیں مقروض ہو گئی۔ سلی نے ان معاملات پر ایک لفظ بھی نہیں بولا بلکہ اپنی ماں کی ہاں میں ہاں ملاتی رہی۔

میرا تو حال گھسے پڑھیر سا ہو جیسا ہی تھا۔ خیر میں ہاں، ہوں کرتا ہوا زندگی کو ڈھونڈتا رہا۔ سب سے اہم بات یہ ہو جاتی کہ مجھے کبھی کبھی خود بھی اپنا ناشہ، ٹھکانا بنا اور کپڑے دھونا پڑتا تھا۔ دیکھ نہیں رہے ہو دو۔ دو بچوں کو پال رہی ہوں، کتنی مصروف رہتی ہوں تم کو تو کچھ فکر رہتی نہیں۔ دیکھو موکھ کر کاٹنا ہونی جاری ہوں۔ یہ نہیں ہوتا کہ ایک کام کرنے والی بی رکھ لیں، باڑے میں ہاتھ پیرن ہو جاتے ہیں اور گرمی میں جلنے لگتے ہیں، منیرہ کے یہاں دو۔ دو ہیں اور ہمارے یہاں ایک بھی نہیں، تم کو تو کوئی پرواہ ہی نہیں۔ سلی۔ جو ایک بار شروع ہو گئی تو بس شروع۔ کتنی دیر بچے کی معلوم نہیں۔

میں ان حالات میں جتنی جلدی ہو گھر سے باہر نکل جانے کی سوچتا رہتا، منتشر ذہن سکون چاہنے کی تلاش میں ادھر ادھر مارا مارا گھومنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ شاید میرے لئے گھر میں سکون نہیں تھا لیکن میں مایوس نہیں ہوں جب بچے بڑے ہو گئے یا کچھ ایسا ہو گا جو میرے علم میں اس وقت نہیں ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ حالات ضرور بدلیں گے۔

□□□

میں نے تجھے دیکھا ہے اپنے دل کی آنکھوں سے۔ اداس، پریشان، بے بس اور ناامید۔ سو آنسو روتے اور بکیتے، ایمان (ذلت) کے گھٹوٹ پیتے اور سہتے..... ماں! سن ماں، مجھے روک لے میں اتنا ہی نہیں چاہتی! اسی دھڑلے جہاں نہ زمان (عزت) ہے نہ نمان (عظمت)۔ سب پتھر دل انسان! ہوس کے بھوکے بیڑیے۔ ہر پل بس نوچے گھسوٹے کو تیار.....

روک لے ماں، روک لے! اب کلا سے رہا نہ گیا۔ اس کی دریائی ممتا بھری آنکھوں سے آنسوؤں کی موجوں نے روانی اختیار کرتے ہوئے بولنا شروع کیا۔ بلیا تو آنا ممت گھرانہ تو میری ہمت اور آنا (امید) ہے۔ میرے دل کی روشنی و سہارا اور بل چل ہے۔ اپنے حوصلوں اور ہمت سے زندگی کا ایک رخ موڑ لائیں گے اور مستقبل کو خوشحال و پرسکون بنائیں گے.....

زندگی کو بنا کر پھولوں کی بغیازہ درہ درہ مہر مہر لگے۔ تو آتو جھج، جھج پیار، محبت، حوصلہ کا سبق پڑھا کر تیری روشن دنیا کو پروان چڑھائیں گے۔ تو ایک بار آتو صحیح تیرے لیے زمانے کو جنت بنائیں گے۔ جنت بنائیں گے..... اور پھر اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ اس کے من میں نہ پڑھ پانے کی جوئیں تھی، جو درد تھا وہ آج انقلاب کی صورت میں بدل چکا تھا۔ اس کے آگے بس ایک ہی منزل تھی کہ اپنی بچی کو پڑھا جائے، کیونکہ پڑھائی ہی روشن مستقبل کی بنیاد اور بلند حوصلوں کی ضمان ہے۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ اسے ایسے خیالات احساسات و آرزوئیں بھی دینا ہیں جس سے وہ ملک و ملت کے لیے کچھ کر سکے۔ یہی سوچ کر اس نے اس کا نام بھارتی رکھا تھا۔ سچی وہاں بچے آکر کھینچنے لگے اور اس کا دھیان بھنگ گیا۔ وہ اٹھی اور وہاں سے سرخ گھر کی طرف چلنے لگی۔ اس کا دماغ بچکولے کھا رہا تھا، سو طرح کی باتیں ذہن کو پریشان کر رہی تھیں۔ آخر بات کیا ہوئی ہوگی؟ کس لیے بلایا ہے سرخ نے؟ دور تک غالی کھیت ہی کھیت تھی۔ وہ پگڈنڈی پر اٹھ بیٹھی سوچتی ہوئی جاری تھی، اپنی طرف سے تو اس نے بہت اچھے سناکار (اخلاق) دیے تھے جب بھی ٹیلی ویژن پر کوئی اچھی اخلاقی کہانی دیکھی سنی، اپنی بیٹی کو ضرور سنائی تو پھر آج!

کچھ دن پہلے اس نے افغانی بھارتی ملالہ کے بارے میں سنا تھا۔ یہ بھی ایک ملک کی کوئی بیٹی خلاء میں جاری ہے۔ کوئی ٹیکسٹ میں سوئے کا تنگ جوت لکرا رہی ہے۔ کوئی ہمالیہ پہاڑ کی چوٹی کو سر کر رہی ہے۔ ان سب میں خود اعتمادی کی کمی تھی۔ ان سب کے حوصلے بلند تھے۔ یہ سب دیکھ کر کلا کو لگتا تھا وہ سب ٹھیک کر رہی ہے۔ اس کو یقین تھا کہ وہ اپنی بیٹی کی پرورش ٹھیک طریقے سے اور صحیح سمت میں کر رہی ہے۔ پر کبھی لگتا تھا شاید کوئی کمی ہوگی کہ ہے تو وہ اپنے ہر جاہل ہی۔ بھلے کتنی ہی مصیبت جھیل کر اس نے اپنی بیٹی کو پڑھایا اور پروان چڑھایا ہو۔ یہی سوچتے سوچتے وہ سرخ کے گھر پہنچ گئی۔ سرخ دوسرے بچوں کے ساتھ بیڑ کے نیچے ہی کھینچا ڈالے بیٹھے تھے۔ کلا بھی رام رام کی ہاتھ جوڑ کر وہیں کھڑی ہو گئی۔ سرخ کلا کو دیکھتے ہی بولے: ”تیری چھوری سے تو ایسی امید تھی“ کلا کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا، کیا ہوا ہوگا؟ سرخ بھی سرخ کی ہاں میں ہاں ملا رہے تھے سرخ بولے: ”ایسی لڑکی نہ دیکھی میں نے پورے کولہ پور میں“ کلا نے کاپٹی ہوئی آواز میں پوچھا: ”کیا ہوا سرخ بیٹی جہاں ج! بھارت! بیٹا سے کوئی گئی (غلطی) ہو گئی؟“ اس پر سرخ بیٹی زور زور سے ہنسے اور بولے: ”تیری لڑکی نے تو ریکارڈ توڑ دیا پورے کولہ پور میں سب سے زیادہ نمبر لائی ہے فرسٹ آئی ہے بارہویں میں!“ سرخ بیٹی کی خوشی ان کے چہرے سے صاف بھلک رہی تھی۔ وہ بچو لے نہیں سمارا ہے تھے، اپنے گاؤں کا نام روشن ہونے پر، انہوں نے فیصلہ لے لیا۔ ”بیٹی، بچاؤ بیٹی پڑھاؤ مہم کو بڑھاؤ دینے کی خاطر کلا کی بیٹی کو گاؤں کا ایک دن کے لیے سرخ بنانے کا۔ اسی کے بعد انہوں نے فیصلہ سنایا اب کی ۱۵ اگست کو ملک کی آزادی کے دن بھارتی بلیا گاؤں میں دیش کا ترنگا پھیرا گئے گی!“

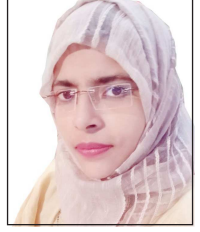
کلا کو تو اپنے کانوں پر یقین ہی نہیں ہو رہا تھا کہ یہ سب سچ ہے۔ اس کا من مارے خوشی کے اچھلنے لگا۔ اور آنکھوں سے خوشی کے آنسو نکلنے لگے۔ سچی اس نے دیکھا کہ اس کی لڑکی بھارتی بیٹی بھی بھاگی بھاگی وہیں آ رہی ہے۔ آتے ہی وہ ماں سے لپٹ گئی اور پھر سرخ اور سچی بچوں کی دعائیں لیں۔ جب بھارتی کو پتہ چلا کہ وہ ایک دن کی سرخ بنائی جا رہی ہے اور ۱۵ اگست کو اپنے گاؤں میں جھنڈا پھیرا گئے گی تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ آج وہ پڑھائی کی اہمیت کو جان گئی تھی۔ اس کی ماں نے اس کی پڑھائی کے لیے جو قربانی دی تھی اسے یاد رکھی بار اس کی آنکھیں بھی نم ہوئی جاری تھیں۔ وہ سوچ رہی تھی اگر اس کی ماں ہمت و حوصلہ نہ دکھائی تو اس کا اس ظالم دنیا میں اتنا ہی ناممکن

تھا..... ماں کی ہمت کی وجہ سے ہی اس نے اس دنیا میں آنکھیں کھولیں اور پھر ماں کی بہادری ہی تھی کہ انہوں نے اس کی پڑھائی پر بہت زور دیا۔ خود اپنے ہوتے ہوئے بھی اس نے پڑھائی کی اہمیت کو اس کے سامنے اجاگر کیا۔

ماں نے پڑھائی پر لگ کر اڑ گئے ہوں اور وہ جین دن بھی آگیا جس دن اسے اپنے دیش کا ترنگا پھیرا تھا۔ سچ پوچھو تو ساری رات اسے نیند ہی نہیں آئی۔ اتنا خوش جو وہ تھی۔ وہیں بھارتی کی ماں بھی بہت زیادہ بے صبری ہو رہی تھی اس دن کے لئے۔ بھارتی کو اس دنیا میں نہ دیکھنے کی خواہش رکھنے والے اور لڑکی کو بوجھ سمجھنے والے اس کے باپ اور اس کی دادی بھی اس پر دو گرام میں جانا چاہتے تھے پر بھارتی کا سامنا نہیں کر پارہے تھے۔ اور نہ ہی ان کی ہمت پڑھائی تھی۔ انہیں آج اپنی ظالم سوچ پر چھٹاوا ہو رہا تھا۔ وہ لوگ سوچ رہے تھے کہ کاش انہوں نے بھی بھارتی کی ماں کا ہمیشہ ساتھ دیا ہوتا! بیٹی کی اہمیت کو سمجھا ہوتا تو آج انہیں اتنے بڑے خوشی کے انمول پلوں میں یوں مایوس نہ بیٹھنا پڑتا۔ وہ سوچ رہے تھے ان کے دو بیٹے بھی تو ہیں۔ دونوں نے کیا کیا؟ ایک نے تو نچا پوچھوں کے بعد اور دوسرے نے آٹھویں کے بعد پڑھائی چھوڑ دی۔ ہم نے ان کے لیے کیا نہیں کیا کھلانے۔ پلانے کپڑے۔ لتے سبھی میں تو ہم نے بھارتی سے زیادہ ان لڑکوں کے ساتھ کیا۔ ماں پر بھی الزام لگایا کہ تم بیٹی سے زیادہ محبت کرتی ہو، بیٹیوں سے نہیں۔ یہ سب جھوٹ تھا۔ وہ سب کو برابر چاہتی تھی۔ وہ تو ماں تھی۔ اس کو ہم نے کبھی ان لڑکوں کی غلطی پر ڈانٹنے تک نہ دیا۔ مگر اس کا کیا نتیجہ نکلا وہ دونوں بدتمیز ہو گئے۔ اور کسی کی نہیں سنتے۔ آوارہ گمور رہے ہیں۔ کیا کریں گے آخر یہ لوگ اپنے آگے کی زندگی میں؟ وہ سوچ رہے تھے کیا کرنا چاہیے؟ سچی بھارتی کر رہے ہیں آئی اور بولی جلدی سے تیار ہو جاؤ ہم سب کو وہاں چلنا ہے۔ بھارتی کا لگتا کہنا تھا کہ بھارتی کے باپ اور دادی کا ہندو کی آمدنی سے من بھر آیا۔ اس سے معافی مانگنے لگے کہ ہمیں معاف کر دو۔ ہم بیٹی کی اہمیت کو سمجھی سمجھ ہی نہیں پائے۔ بھارتی نے دونوں کی آنکھوں سے آنسو پوچھے اور بولی کہ آپ تو ہمارے بڑے ہیں آپ لوگوں سے ناراض ہونے کا تو میں سوچ ہی نہیں سکتی۔ پھر بولی: ”بس اب نا تم نہیں ہے کیونکہ وقت پر پہنچنا ہے۔ جلدی سے تیار ہو جاؤ۔“

تھوڑی ہی دیر میں بھارتی کے گھر والے کچھ شرمندگی کچھ خوشی کے ملے جلے سنگم کے ساتھ اسکول تکس میں موجود تھے۔ اپنے گاؤں کا نام روشن کرنے والی اس بلیا کو دیکھنے کے لیے ماں پورا گاؤں اڑ پڑا ہو۔ چھوٹے چھوٹے سچے بھی جیرانی سے اپنی اس بھارتی دیدی کو دیکھ رہے تھے۔ گاؤں کے لوگ اسے اپنا ہیرو ماننے لگے تھے۔ آس پاس کے گاؤں والوں کے ساتھ ساتھ میڈیا و نیوز چینل والے بھی کورج کے لیے آتے ہوئے تھے۔ پروگرام شروع ہوا۔ بھارتی کو سچ پر بلایا گیا۔ بھارتی نے تعلیم کی اہمیت اور بیٹیوں کی ضرورت پر ایک زوردار تقریر کی۔ اس نے بتایا کہ سماج اور ملک کی ترقی کے لیے بیٹیوں کی کیا اہمیت ہے۔ اور اس نے کہا کہ ترقی کی منزل کو پار کرنے کے لیے پڑھی لکھی لڑکیوں کی ضرورت ہے۔ گاؤں والوں نے اپنی تالیوں کی گڑ گڑا ہٹ سے اس کی بات کی تائید کی۔

پھر وہ وقت آیا جس کا اسے اتنے دنوں سے بے صبری کے ساتھ انتظار تھا۔ منج پر کھڑی بھارتی کی آنکھیں اپنی پیاری ماں کو تلاش کر رہی تھیں۔ پھر یہ تلاش کامیاب ہوئی اور اسے ایک طرف ماں کھڑی نظر آئی۔ بھارتی نے اپنے ساتھ کھڑے ایک ٹچر سے ماں کو اوپر لانے کے لیے درخواست کی۔ ماں اب اس پر آگئی تھی۔ بھارتی اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ کر جھنڈا پھیرانے والی جگہ پر اپنے ساتھ لگے۔ ماں کے ساتھ مل کر اس نے طاقت، امن اور خوشحالی والے ترنگے کو پھیرا۔ ترنگے سے جھڑتی پھولوں کی پنکھڑیوں نے اپنی خوشبو کی برسات سے بھارتی کا استقبال کیا۔ تو جن جن گن من بختا شروع ہوا اور موجود سبھی لوگ کھڑے ہو کر قومی ترانہ گانے لگے۔ بھارتی نے دیکھا اس کے باپ اور دادی بھی اس کو پکھتوے کی جھلملاتی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اور شرمندگی کی وجہ سے گاؤں والوں سے آنکھیں چار نہیں کر پارہے ہیں۔ بھارتی من ہی من سوچ رہی تھی یہ تو محض ایک شروعات ہے۔ ابھی ہماری منزل بہت آگے ہے۔ ابھی ہم کو ایک بہت بڑی ذاکٹر بنانا ہے اور گاؤں والوں کا علاج کر کے ان کا من جیتنا ہے۔ پھر سماج میں پھیلی لڑکیوں سے نفرت کی برائی کو دور کرنے کے ساتھ، بیٹی، بچاؤ بیٹی پڑھاؤ کے نعرے کو بھی کامیاب کرنا ہے!!!



عافیہ حمید

اے۔ ۱۴۲۹/۳، نزد مینا مارکیٹ اندرا نگر، لکھنؤ

7897811988

افسانچہ

کانچ کی گڑیا

صاف کیا گیا۔ رات تک ہمارے گھر میں ایک فرد کا اضافہ ہو چکا تھا۔ مجھے یاد ہے اس رات اماں رات بھر جائے نماز پر کھڑی رہیں۔ اماں روتی جاتیں اور دعائیں مانگتیں۔ میں تو کئی دن ابا کے سامنے نہیں گئی۔ اماں کی ہنسی اس دن کے بعد کبھی گھر میں نہیں گونجی۔ کچھ دنوں کے بعد گھر میں نئے مہمان کی آمد ہوئی۔ میں نے دیکھا اماں نے اس وقت بھی دل بڑا کر کے نئی اماں کی خوب خدمت کی۔ زندگی ایک رفتار سے دوڑنے لگی۔ بہن کے بعد ایک بھائی کی کلکاری بھی ہمارے صحن میں گونجنے لگی۔ گھر کا آنگن ایک بار پھر آباد ہو چکا تھا مگر اماں کے دل کا آنگن ویران ہو چکا تھا۔ جب کبھی اماں دادی یا پھوپھی سے اماں کا شکوہ کرتیں، دادی پھوپھی اماں کو دین و مذہب کا حوالہ دے کر چپ کر دیتیں۔

اماں خود ہی شکوہ نہ کرتیں اگر ابانی اماں کے آجانے کے بعد مجھے اور اماں کو بھول نہ گئے ہوتے۔ اباسوائے کھانا کپڑا کے اپنی تمام ذمہ داریوں کو بھول چکے تھے۔ ہاں، کبھی کبھی ابامیرے رشتے کو لے کر دادی سے مشورہ ضرور کرتے۔ اماں اور دادی کو لگتا تھا میرا رشتہ کسی مذہبی گھرانے میں ہو۔ ابا کی کوشش کامیاب ہوئی۔ مسجد کے امام صاحب کے بیٹے کا رشتہ آیا تھا۔ اس دن ابانے برسوں بعد اماں کا نام لے کر پکارا۔ نفیسہ بیگم، مریم کا رشتہ آیا ہے۔

آج شام کچھ مہمان آئیں گے۔ کچھ خاص اہتمام کرلو۔ میں نے دیکھا اماں کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔ ابا کے سامنے اماں کی کیا مجال تھی کہ وہ کچھ کہتیں۔ بس اماں نے میری طرف حسرت سے دیکھا۔ میری روح کانپ گئی۔ اماں کی زندگی کی تصویر ایک بار میرے سامنے گردش کرنے لگی۔ شام کو گھر میں مہمانوں کی آؤ بھگت کی تیاریاں ہو رہی تھیں مگر اماں خاموش تھیں۔ ان کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ وہ بس مجھے دیکھے جارہی تھیں۔ ان کی آنکھیں مجھ سے کچھ کہہ رہی تھیں۔ شام کو مہمان آئے اور رسم کی انگوٹھی پہنا گئے۔

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا۔ اماں کے سسکنے کی آواز پر میری نیند کھل گئی۔ اماں اماں، میرا گلا روند گیا۔ ابا! دادی! پھوپھی! میں نے آواز لگائی۔ جب تک ابا دادی آتے اماں کی سانس اکھڑ گئی۔ مگر اماں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر انگوٹھی کو بغور دیکھا اور کہا تمہارا نام مریم ہے۔ تم کانچ کی گڑیا نہیں۔ کانچ کی گڑیا کو پتھروں کا صحن نصیب ہوا۔ اماں کی آنکھیں کھلی رہیں۔ لاکھ کوششوں کے بعد بھی وہ بند نہیں ہوئیں۔ رات بستر پر لیٹتے ہی اماں کے بستر پر نظر پڑی۔ اماں کا بستر خالی تھا۔ مگر مجھے محسوس ہو رہا تھا آج اماں چین سے سو رہی تھیں۔ اماں کا ہاتھ میری انگلیوں کو چھوتا ہوا انگوٹھی تک پہنچا۔ اچانک لکسی نے انگوٹھی میری انگلی سے نکال لی ہو۔ میں نے اپنی انگلی کو ٹٹولا۔ واقعی انگوٹھی غائب تھی۔

□□□

اماں کے آخری الفاظ یہی تھے ”کانچ کی گڑیا کو پتھروں کا صحن نصیب ہوا“۔ ابا سکتے ہیں کبھی مجھے کبھی اماں کے بے جان جسم کو دیکھتے۔ اچانک توتوں کے بھونکنے کی آواز تیز ہو گئی تھی۔ بارش تھی کہ رکنے کا نام نہ لیتی۔ گھر جگہ جگہ سے بوسیدہ ہو چکا تھا۔ بارش کی بوندوں نے دیوار اور چھت سب کو بے رنگ کر دیا تھا۔

فجر کی اذان ہوتے ہی محلے کے لوگ ہمارے صحن میں جمع ہونے لگے۔ ہر ایک کی زبان پر اماں کی پاکیزگی کی باتیں تھیں۔ ان کے صبر و استقامت اور وفاداری کے قصے تھے۔ اماں کا نورانی چہرہ کفن میں لپٹا تھا مگر نہ جانے کیوں اماں کی آنکھیں کھلی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں آج بھی وہی انتظار تھا جو ہمیشہ میں نے ان کی آنکھوں میں دیکھا۔ اماں اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھیں۔ اماں کو ان کے میکے میں پیار سے گڑیا پکارتے۔

نانا کو جب زیادہ پیار آتا تو کہتے میری کانچ کی گڑیا۔ اماں تھیں بھی بالکل نازک، دلی پتی، اجلا رنگ، خوبصورت آنکھیں۔ اماں کی انگلیاں بالکل نازک تھیں۔ ذرا سب سے پر مسالہ پیس لیتیں تو گھنٹوں انگلیاں جلتی رہتیں اور تھیلی بالکل سرخ ہو جاتی۔ مگر اماں کے نصیب کا کیا کہا جائے!! جب اماں دس برس کی تھیں تبھی نانا کا انتقال ہو گیا۔ زندگی ایک موڑ پر رک گئی تھی۔ مگر اماں کی خوبصورتی دیکھتے ہوئے ابھی گھروں کے رشتے آنے لگے۔ نانی کا کہنا تھا کسی مذہبی گھرانے میں بچی کا بیاہ کروں گی تاکہ اس کے شوہر کو اللہ کا خوف ہوگا۔ بیوی بچوں کے حقوق پہچانے گا۔ اور نانی کی زبان مبارک۔ گاؤں کے مشہور صوفی کے گھر اماں کی نسبت بٹھری۔ نانی کی خواہش پوری ہوئی تھی۔ اماں سرخ جوڑے میں کچے آنگن سے کچے صحن میں آگئی تھیں۔ نانی نے رخصتی کے وقت اماں کو قرآن پکڑاتے ہوئے کہا: ”گڑیا! سرخ جوڑے میں بھیج رہی ہوں، واپسی ابلے لباس میں ہو۔ مرحوم باپ اور بوڑھی ماں کا واسطہ۔۔۔ شوہر مجازی خدا ہے۔“

اماں نے نانی کی باتوں کو کوئی آسمانی قول سمجھ کر اس پر اس طرح ایمان لائیں کہ دنیا ادھر سے ادھر مگر اماں اپنے ایمان کو بچا ہر غم سہ گئیں۔

میں نے جب سے ہوش سنبھالا ابا اور بھائی کو دو ہی کاموں میں مصروف پایا۔ یا تو ابا اور بھائی اپنے کاروبار کو بڑھانے کی فکر میں رہتے یا پھر دینی کاموں سے اکثر باہر رہتے۔ میں مدرسہ سے گھر آتی تو کبھی اماں کو کپڑے دھوتے دیکھتی کبھی کھانا پکاتے۔ کبھی دادی اور پھوپھی کی خدمت گزاریاں کرتے دیکھتی۔ زندگی پھر بھی پرسکون تھی۔ مگر ایک دن گھر میں غیر معمولی جہل پہل تھی۔ دادی اور پھوپھی مسکرا رہی تھیں مگر اماں کی آنکھیں سو جی ہوئی تھیں۔ میں نے اماں سے پوچھا تو اماں کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ اماں خاموشی سے روتی رہیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ مگر شام ہوتے ہی ابانی شیر وانی پہنہ مسکراتے کہیں عجلت میں نکل گئے۔ برابر کا کمرہ

شاہد عباس
مفتی گنج، چوک لکھنؤ

9839346181



ترقیات

اتر پردیش میں غریبوں کیلئے اپنا گھر

اصول وضوابط بنائے گئے ہیں۔ کونسل کے تمام قواعد وضوابط کو گزٹ نوٹیفیکیشن کے ذریعے عام کر دیا گیا ہے۔ بے سہارا لوگوں کے لیے رہائش رہنے کے لیے گھر سب کو چاہیے لیکن اس کی سب سے زیادہ ضرورت ان لوگوں کو ہوتی ہے جن کے پاس سر ڈھانپنے کے لیے چھت تک نہیں ہوتی جس کے بعد وہ عوامی مقامات پر رہنے پر مجبور ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے ”آشریہ ہوجا“ کے تحت مختلف مقامات پر 8480 رہائشی یونٹ بنائے گئے ہیں۔ متوسط طبقے کے لیے ہاؤسنگ سکیم مزید برآں، نچلے متوسط طبقے کے لوگ ہیں جنہیں اس طرح کی خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے، UPAVP نے اب تک 200000 ہاؤسنگ یونٹ بنائے ہیں، اور اس مالی سال میں مزید 550 ہاؤسنگ یونٹ بنانے کا بھی منصوبہ ہے۔

ملٹی اسٹوری کمرشل آرکید اور آفس ان کاموں کے علاوہ، UPAVP نے کثیر المنزلہ دفاتر اور تجارتی ناؤز تعمیر کیے ہیں، جو خود کونسل کے زیر استعمال ہیں اور عوامی استعمال کے لیے کھلے ہیں۔ عوامی سہولیات کی فراہمی بھی کونسل کی ترجیح ہے۔ نئی انتظامی تکنیک جدید انتظامی تکنیکوں کی ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے، UPAVP نے اپنی تیز رفتار ترقی کے لیے مختلف جدید طریقوں اور تکنیکوں کو اپنایا ہے، جیسے: بات چیت کے ذریعے زمین عام طور پر زمین کے حصول کا عمل وقت طلب اور بوجھل ہوتا ہے۔ UPAVP اب شہری رہائشی پروگراموں کو نافذ کرنے کے لیے کسانوں/ زمین کے مالکان سے براہ راست بات چیت کرتا ہے۔ زمین کے حصول کا یہ عمل کافی آسان اور کامیاب ثابت ہوا ہے۔ UPAVP ”فائدے کی تقسیم کی بنیاد پر“ زمین حاصل کرنے کا بھی منصوبہ رکھتا ہے۔ یہ تعمیری قدم زمین کے مالکان کو اپنی زمین رہائشی اور شہری ترقیاتی منصوبوں کے لیے پیش کرنے کی ترغیب دے گا۔ UPAVP مشترکہ طور پر نجی ڈویلپر ز اور تنظیموں (آشریہ رہائش کے لیے) کے ساتھ معاہدہ کر رہا ہے۔ اس کے بعد جدید ٹیکنالوجی اور زلزلہ مزاحم ٹیکنالوجی کا استعمال کرتے ہوئے نئے مکانات بنائے گئے۔ مینوفیکچرنگ سینٹر نئے مینوفیکچرنگ مواد کو بنانے اور نافذ کرنے کے مقصد کے ساتھ، UPAVP نے ریاست میں اپنے 4 مینوفیکچرنگ مراکز قائم کیے ہیں۔ کونسل اور دیگر بلدیاتی اداروں کی مختلف ہاؤسنگ سکیموں کے ذریعے ان مراکز میں نیامود تیار کیا جا رہا ہے۔ عوامی ازالہ الاٹیوں اور زمین کے مالکان وغیرہ کے مسائل کو مد نظر رکھتے ہوئے کونسل میں 1997 سے عوامی ازالہ کا نظام نافذ کیا جا رہا ہے۔ روبرو سماعت اور موقع پر فیصلہ کرنے کا انتظام ہے۔ عوام کے سوالات سننے اور ان کے حل کی ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے۔ کونسل نے اپنی سرگرمیوں کو بڑے پیمانے پر دوسرے محکموں اور ایجنسیوں میں متنوع کر دیا ہے۔ اس وقت کونسل کے پاس 63.333 کروڑ روپے کے منصوبے ہیں جن میں 4 سے 10 کثیر المنزلہ عمارتوں کی تعمیر اور ان کا بنیادی ڈھانچہ شامل ہے۔ 300 بستروں کی گنجائش والے ہسپتال، مختلف سرکاری محکمے، شعلی ہیڈ کوارٹر کی مجموعی ترقی اور تعمیرات اور بہت بڑے گروپ ہاؤسنگ تعمیر کیے جا رہے ہیں۔

یو پی کی ہاؤسنگ ایجنسیوں میں ایک نوڈل ایجنسی کے طور پر نمایاں مقام رکھتی ہے۔ اس کا قیام اپریل 1966 میں ریاست کے رہائشی مسائل پر قابو پانے کے لیے کیا گیا تھا۔ اپنے قیام سے لے کر اب تک اس کونسل نے رہائشی علاقوں میں کافی ترقی کی ہے اور اب بھی کر رہی ہے۔ ہڈو کے زیر اہتمام قومی سطح کا ہاؤسنگ مقابلہ 1976 اور 1979 میں کونسل نے جیتا تھا۔ جنرل ہاؤسنگ پروجیکٹ کے علاوہ، UPAVP ریاست کی تمام قسم کی شہری رہائشی ترقیاتی اسکیموں کی منصوبہ بندی، ڈیزائن، تعمیر اور ترقی جیسے مختلف کاموں میں بھی حصہ لے رہی ہے۔ UPAVP نے مختلف منصوبوں کی منصوبہ بندی کی ہے اور کامیابی کے ساتھ ان پر عملدرآمد کیا ہے۔

مزید برآں، UPAVP نے صحت اور تعلیم کے مختلف ترقیاتی منصوبوں کی منصوبہ بندی اور کامیابی کے ساتھ ان پر عملدرآمد کیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ کونسل سٹریٹ ہیڈ کوارٹر کے پراجیکٹس پر بھی کام کر رہی ہے، جس کے تحت مختلف سکیموں پر کام جاری ہے۔ UPAVP اس قدر قابل ہے کہ یہ رہائشی کالونیوں اور شہروں میں بڑے پیمانے پر کام کر سکتا ہے۔ UPAVP ایک خود مختار ادارہ ہے اور یہ کونسل اپنے تمام کام اپنے وسائل کا استعمال کرتے ہوئے انجام دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

اگر دوسرے وسائل کی ضرورت ہو تو وہ مختلف مالیاتی اداروں جیسے ہاؤسنگ اینڈ اربن ڈیولپمنٹ کارپوریشن، یونٹڈ سٹٹ آف انڈیا، ایل آئی سی بینکس، ایچ ڈی ایف سی وغیرہ کی مدد سے بنائے جاتے ہیں۔ سال 2008-09 کے لیے 115976 لاکھ روپے کی بجٹ آمدنی اور 93169 لاکھ کے اخراجات کے ساتھ، UPAVP کی مالی بنیاد مضبوط ہے۔ گزشتہ کئی سالوں کے دوران، کونسل نے تمام قسم کے رہائشی اور شہری ترقیاتی منصوبوں میں خود کو بہتر ثابت کیا ہے۔ UPAVP ٹرن کی بنیاد پر ہندوستان کے اندر یا باہر کسی بھی پیمانے کے منصوبوں کو انجام دینے کے قابل ہے۔ UPAVP نے 137 شہروں میں اپنی سرگرمیوں کے لیے مطلع کیا ہے۔ کونسل نے 78 شہروں میں 24.621 ٹیکٹر اراضی حاصل کی ہے، جس پر ہاؤسنگ سکیمیں نافذ کی گئی ہیں۔ UPAVP نے اب تک مختلف سائز کی 280247 زمینیں اور مکانات تیار کیے ہیں، جو معاشرے کی ضرورت کے مطابق کام کر رہے ہیں۔ یہ سماج کی بہتری کے لیے UPAVP کی طرف سے ایک چھوٹا سا تعاون ہے۔

انسانی وسائل UPAVP ایک پیشہ ورانہ طور پر منظم تنظیم ہے جس میں فن تعمیر، ٹاؤن پلاننگ، تعمیراتی ٹیکنالوجی، انفراسٹرکچر ڈیزائن، عملدرآمد اور دیکھ بھال، مالیاتی انتظام وغیرہ جیسے مختلف شعبوں کے ماہرین شامل ہیں۔ سینئر ماہرین اور افسران اور انتظامی سربراہان کونسل کے مختلف شعبوں کو سنبھال رہے ہیں۔ معیار UPAVP نے اپنے تمام کاموں میں معیار کا پورا خیال رکھا ہے، جس کے لیے اس نے اپنا کوٹلی کنٹرول مینوئل تیار کیا ہے۔ کونسل نے ایک مرکزی لیبارٹری اور کئی علاقائی ٹیسٹنگ لیبارٹریز قائم کی ہیں۔ اس کے علاوہ کئی سائٹ لیبارٹریز ہیں جن میں کونسل کی تمام اسکیمیں مربوط ہیں۔ شفافیت کونسل کی طرف سے کسی بھی کام کو انجام دینے کے لیے کچھ مقررہ



جناب وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ راجدھانی لکھنؤ میں ڈبل ڈیکر بس کوہری جھنڈی دکھا کر افتتاح کرتے ہوئے۔



جناب وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ گومتی کتاب میلہ میں طلباء و طالبات کے ساتھ وقت گزارتے ہوئے۔

वर्ष : 78 अंक 3
जुलाई, 2023
मूल्य : 15 रु./—
वार्षिक मूल्य : 180 रु./—

उर्दू मासिक, **नया दौर**
पोस्ट बॉक्स सं० 146,
लखनऊ — 226 001

पंजीयन संख्या : 4552/51
एल० डब्लू/एन० पी०/101/2006—08
ISSN 0548-0663 (UGC CARE List)



सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र. स्वत्वाधिकारी के लिए शिशिर, निदेशक, सूचना एवं जनसम्पर्क विभाग, उ.प्र. लखनऊ द्वारा प्रकाशित तथा
प्रकाश एन. भार्गव, प्रकाश पैकेजर्स, प्रथम तल, शगुन पैलेस, 3—सप्रू मार्ग, लखनऊ द्वारा मुद्रित, सम्पादक— रेहान अब्बास